تقابلی مطالعہ پروگرام

مسلم دنیا میں پائے جانے والے گروہوں کا تقابلی مطالعہ

ماڈیول CS01: اہل سنت، اہل تشیع اور اباضی

محمد مبشر نذیر

www.islamic-studies.info

فہرست

اس پروگرام کا مقصد کیا ہے اور یہ کس کے لیے ہے؟ 3

سبق 1: اہل سنت، اہل تشیع اور اباضیہ کا تعارف 4

سبق 2: احادیث نبوی کے بارے میں اہل سنت اور اہل تشیع کا نقطہ نظر 8

سبق 3: مسئلہ امامت 11

سبق 4: صحابہ کرام، اہل بیت اور خلافت 27

سبق 5: بعد کے ادوار کی تاریخ 44

سبق 6: متعہ 64

سبق 7: تقیہ اور عقیدہ مہدویت 71

سبق 8: محرم الحرام کی رسوم اور باغ فدک 76

سبق 9: اہل تشیع کے ذیلی فرقے 87

سبق 10: اہل سنت اور اہل تشیع کی تاریخ کا سیاسی اور معاشرتی پہلو 99

سبق 11: خوارج، اباضی اور اہل سنت 103

سبق 12: ماڈیول CS01 کا خلاصہ 115

اگلا ماڈیول 117

ببلیوگرافی 118

اگر آپ نے اس پروگرام کے تعارف کا مطالعہ نہیں کیا تو اس کتاب کے پڑھنے سے پہلے اس کا مطالعہ کر لیجیے۔ تعارف کو ڈاؤن لوڈ کرنے کے لیے وزٹ کیجیے۔

www.mubashirnazir.org/courses/comparative/CS001-01-Introduction.htm

اس پروگرام کا مقصد کیا ہے اور یہ کس کے لیے ہے؟

اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ امت مسلمہ کے مختلف گروہوں اور مکاتب فکر کے مابین جو اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کا ایک غیر جانبدارانہ (Impartial) مطالعہ کیا جائے اور ان کے نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ ان کے استدلال کا جائزہ بھی لیا جائے۔

اس پروگرام میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ تمام نقطہ ہائے نظر کو، جیسا کہ وہ ہیں، بغیر کسی اضافے یا کمی کے بیان کر دیا جائے۔ ان کے بنیادی دلائل بھی جیسا کہ ان کے حاملین بیان کرتے ہیں، واضح طور پر بیان کر دیے جائیں۔ ہم نے کسی معاملے میں اپنا نقطہ نظر بیان نہیں کیا اور نہ ہی کوئی فیصلہ سنایا ہے کہ کون سا نقطہ نظر درست اور کون سا غلط ہے۔ یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔

یہ پروگرام ان لوگوں کے لیے ہے جو:

- وسیع النظر ہوں
- مثبت انداز میں مختلف نقطہ ہائے نظر کو سمجھنا چاہتے ہوں
- منفی اور تردیدی ذہنیت کی رو سے مطالعہ نہ کرتے ہوں
- دلیل کی بنیاد پر نظریات بناتے ہوں نہ کہ جذبات کی بنیاد پر
- اپنے سے مختلف نظریہ کو کھلے ذہن پڑھ سکتے ہوں اور اس میں کوئی تنگی اپنے سینے میں محسوس نہ کرتے ہوں

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ میں یہ خصوصیات موجود ہیں، تو آپ کا تعلق خواہ کسی بھی مکتب فکر سے ہو، آپ اس پروگرام میں شامل کتب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ خصوصیات آپ میں موجود نہیں ہیں، تو پھر یہ سلسلہ ہائے کتب آپ کے لیے نہیں ہے۔

سبق 1: اہل سنت، اہل تشیع اور اباضیہ کا تعارف

لفظ "شیعہ" کا معنی ہے گروہ، جتھا یا پارٹی۔ یہ لفظ قرآن مجید میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "تشیع" کا مطلب ہے گروہ بنانا۔ عہد صحابہ میں یہ لفظ کسی بھی گروہ یا پارٹی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ جب سیدنا علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین اختلاف رائے ہوا تو ان کے گروہوں کو علی الترتیب "شیعان علی" اور "شیعان معاویہ" کہا گیا۔ بعد کی صدیوں میں یہ لفظ صرف "شیعان علی" کے لئے خاص ہو گیا۔ موجودہ دور میں شیعہ اہل سنت کے بعد دوسرا بڑا فرقہ ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ شیعہ مسلمانوں کی کل تعداد کا 15-10 فیصد ہیں۔ ممکن ہے کہ اس تناسب میں کچھ کمی بیشی ہو کیونکہ اقلیتی آبادیوں کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہوتا۔ ایران، عراق، آذر بائیجان اور بحرین میں یہ اکثریت میں ہیں جبکہ لبنان، پاکستان، ہندوستان، یمن، کویت، عرب امارات اور بعض دیگر ممالک میں یہ ایک بڑی اقلیت میں شمار ہوتے ہیں۔ ایران کے بعد دنیا میں سب سے بڑی شیعہ آبادی پاکستان میں ہے۔

اس کے برعکس "اہل السنۃ والجماعۃ" کا مطلب ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی پیروی کرنے والے اور مسلمانوں کی جماعت یعنی حکومت کی پیروی کرنے والے۔ عہد صحابہ کے بعد جب مختلف فرقے بننے لگے تو یہ اصطلاح ان مسلمانوں کے لئے استعمال ہوئی جو کہ کسی خاص گروہ سے وابستہ نہ تھے بلکہ حکومت وقت کی اطاعت کرتے تھے اور مسلمانوں کے تواتر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سنت منتقل ہوتی چلی آ رہی تھی، اس کی پیروی کرتے تھے۔ واضح رہے کہ شیعہ بھی سنت کا انکار نہیں کرتے بلکہ انہیں اصرار ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے وابستگی کے باعث اصلی اہل سنت وہی ہیں۔ موجودہ دور میں اندازہ ہے کہ اہل سنت مسلم آبادی کا 90-85 فیصد ہیں۔ ایران، عراق، آذر بائیجان، لبنان اور بحرین کے علاوہ تقریباً تمام ہی ممالک میں اہل سنت کی تعداد اکثریت میں ہے۔ ان ممالک میں بھی ان کا شمار بڑی اقلیتوں میں ہوتا ہے۔ سنت کی نسبت سے انہیں مختصراً "سنی" بھی کہا جاتا ہے۔

اہل سنت اور اہل تشیع سے ہٹ کر ایک فرقہ اور بھی ہے جو "اباضیہ" کہلاتے ہیں۔ یہ بھی ایک قدیم گروہ ہے۔ شیعان علی میں سے ایک گروہ نے ان کے خلاف بغاوت کر دی تھی، جو کہ بعد میں "خوارج" کہلائے۔ یہ ایک نہایت انتہا پسند گروہ تھا، جو تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر ان کی جان لینے اور ان کا مال لوٹنے کو جائز سمجھتا تھا۔ انہی خوارج میں سے ایک نسبتاً اعتدال پسند گروہ ان سے الگ ہوا، جنہیں "اباضیہ" کہا جاتا ہے۔ اباضی مسلک کے لوگ اس وقت عمان میں اکثریت میں ہیں جبکہ لیبیا، الجزائر اور تنزانیہ میں ان کی بڑی اقلیتی آبادیاں موجود ہیں۔

اس ماڈیول میں ہم ان تینوں گروہوں کے عقائد، امتیازی اعمال، تاریخ، سیاسیات، سماجی حرکیات (Dynamics) اور ایک دوسرے سے تعامل (Interaction) کا جائزہ لیں گے۔ پہلے دس اسباق میں ہم سنی اور شیعہ اختلافات کا مطالعہ کریں گے اور ماڈیول کے آخر میں ایک

سبق خوارج اور اباضی مسلک سے متعلق ہے۔

اہل سنت، اہل تشیع اور اباضیہ کے مابین مشترک امور

اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین دین اسلام کے بنیادی عقائد اور اعمال پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ تینوں ہی اللہ تعالی کی توحید کے قائل ہیں اور شرک کی سختی سے نفی کرتے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا پیغمبر اور آخری نبی مانتے ہیں، سابقہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام پر ایمان رکھتے ہیں، آخرت کے عقیدے، جزا و سزا اور جنت و جہنم پر ایمان رکھتے ہیں۔ تینوں ہی قرآن مجید کو آسمانی کتاب مانتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو تینوں ہی مانتے ہیں اور آپ سے منقول احادیث کی بنیاد پر دین کو سمجھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تینوں کے ہاں احادیث کے صحیح و ضعیف ہونے کو پرکھنے اور قبول کرنے کے معیار میں کچھ فرق ہے۔

اہل سنت، اہل تشیع اور اباضیہ دین کی بنیادی اخلاقیات جیسے عدل، احسان، خشوع و خضوع، توبہ و انابت، عجز و انکسار پر یقین رکھتے ہیں۔ اخلاقی برائیوں جیسے تکبر، ریاکاری، حسد، بغض، بدگمانی کو برا سمجھتے ہیں۔ ان تمام معاملات میں ان کے ہاں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے۔

شریعت کے معاملے میں بھی تینوں گروہ بنیادی امور پر متفق ہیں۔ تینوں ہی کے ہاں پانچ نمازیں فرض ہیں اور ان کی لازم یا فرض رکعتوں کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ نماز کی جزوی تفصیلات میں البتہ کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ روزہ، زکوۃ اور حج کی مشروعیت (شریعت کا حصہ ہونے) کے بارے میں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ ان کے تفصیلی طریقہ کار کے بارے میں کچھ فروعی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ نکاح و طلاق، رسوم و آداب، جہاد، خورونوش وغیرہ کے معاملات میں بھی تینوں بنیادی امور پر متفق ہیں البتہ تفصیلات میں کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں۔

اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین بڑے اختلافات

اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین متعدد امور ایسے ہیں جن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض امور میں یہ اختلاف بہت شدید ہے جبکہ دیگر امور میں یہ اختلاف بہت بڑا اور شدید نہیں ہے۔ اس کتاب میں ہم خود کو صرف انہی امور تک محدود رکھیں گے جن کے معاملے میں اختلاف میں شدت پائی جاتی ہے کیونکہ یہی وہ مسائل ہیں جن میں اختلاف کے باعث دونوں فرقوں میں حد امتیاز واضح ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض اختلافات عقیدے کی نوعیت کے ہیں، بعض کا تعلق تاریخ سے ہے اور بعض کا فقہی امور سے۔ ان کی اجمالی فہرست یہ ہے:

- احادیث نبوی کی قبولیت میں اختلاف
- عقیدہ امامت
- اسلامی تاریخ کو دیکھنے کا انداز
- صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار علیہم الرضوان کا مقام و مرتبہ
- متعہ
- تقیہ
- محرم الحرام کی رسوم
- باغ فدک

اگلے اسباق میں ہم ان تمام مسائل پر ایک ایک کر کے بحث کریں گے اور ان سے متعلق فریقین کے دلائل کا جائزہ لیں گے۔

اہل سنت اور اباضیہ کے مابین بڑے اختلافات

اہل سنت اور اباضیہ کے درمیان جو بڑے اختلافی مسائل ہیں، وہ یہ ہیں:

- مجموعہ ہائے حدیث
- جہنم میں گناہ گار کے ہمیشہ رہنے کا عقیدہ
- مسئلہ امامت
- اسلامی تاریخ کو دیکھنے کا انداز
- حکمران کے خلاف بغاوت

اسائن منٹس

- اہل سنت اور اہل تشیع کن امور پر متفق ہیں؟ ان کی ایک فہرست تیار کیجیے اور اپنے سابقہ علم کی بنیاد پر کوئی سے چار امور کی وضاحت کیجیے۔

- انٹرنیٹ پر اہل سنت اور اہل تشیع کے بارے میں تلاش کیجیے کہ ان کی آبادیاں کن کن ممالک میں کس تناسب سے پائی جاتی ہیں؟
- اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین بڑے اختلافی امور کون کون سے ہیں؟ ان کی ایک فہرست تیار کیجیے۔

تعمیر شخصیت

اپنے ہر کام کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کرنے کی عادت پیدا کیجیے۔

سبق2: احادیث نبوی کے بارے میں اہل سنت اور اہل تشیع کا نقطہ نظر

اہل سنت اور اہل تشیع میں اس بات پر اتفاق رائے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث امت کے لئے حجت ہیں۔ دونوں ہی اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ صرف اسی حدیث کو قبول کیا جائے گا جو روایت و درایت کے اصولوں پر پورا اترتی ہو۔ روایت کے اصولوں سے مراد یہ ہے کہ حدیث جن جن افراد کے توسط سے ہم تک پہنچی ہو، ان سب کا قابل اعتماد اور اچھے کردار کا ہونا ضروری ہے اور یہ بات بھی لازم ہے کہ ان صاحبان کا حافظہ درست ہو اور انہوں نے حدیث کو محفوظ رکھنے کا اہتمام بھی کیا ہو۔ درایت کے اصولوں سے مراد یہ ہے کہ حدیث قرآن مجید، دیگر صحیح احادیث اور عقل عام کے خلاف نہ ہو۔

اس اصولی اتفاق کے بعد اہل سنت اور اہل تشیع میں اختلاف اس امر پر ہے کہ حدیث بیان کرنے والے جن راویوں کو اہل تشیع قابل اعتماد سمجھتے ہیں، وہ اہل سنت کے نزدیک قابل اعتماد نہیں ہیں۔ بالکل اسی طرح اہل سنت کے بہت سے راوی ایسے ہیں جو اہل تشیع کے نزدیک ناقابل اعتماد ہیں۔ اہل تشیع کے نزدیک صحیح حدیث کی تعریف یہ ہے کہ "وہ حدیث جس کا سلسلہ سند معصوم تک منتہی ہوتا ہو اور ہر طبقہ کے راوی اثنا عشری اور عادل ہوں۔"[1] اس کے برعکس اہل سنت کے نزدیک صحیح حدیث کی تعریف یہ ہے کہ وہ حدیث جو ثقہ راوی، دوسرے ثقہ راوی سے روایت کرے، حدیث کا سلسلہ سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو، حدیث میں دوسری صحیح احادیث کے خلاف کوئی بات نہ پائی جاتی ہو اور نہ ہی کوئی اور پوشیدہ خامی (علت) پائی جائے۔"[2]

ان دونوں تعریفوں میں دو بنیادی امور کا اختلاف ہے:

- اہل تشیع کے نزدیک کسی بھی معصوم ہستی کی بات حدیث کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ان کے ائمہ بھی شامل ہیں۔ اہل سنت کے نزدیک صرف اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات حدیث ہے۔
- اہل تشیع کے نزدیک حدیث کے صحیح ہونے کے لیے تمام راویوں کا شیعہ ہونا ضروری ہے۔ اس کے برعکس اہل سنت تمام فرقوں کے قابل اعتماد اور اچھی شہرت کے حامل راویوں سے حدیث قبول کر لیتے ہیں۔ ہاں اہل تشیع اور خوارج کے راویوں کی ان احادیث کو وہ درست تسلیم نہیں کرتے، جس میں ان کے اپنے فرقے کی حمایت موجود ہو۔

راویوں کے اس فرق کی وجہ سے اہل سنت اور اہل تشیع کے مجموعہ ہائے احادیث الگ الگ ہیں۔ اہل سنت کے نزدیک احادیث کی سب سے مستند کتابیں وہ ہیں جو امام مالک (93-179/711-795)، امام بخاری (194-256/810-870) اور امام مسلم (204-261/819-875)

نے تصنیف کیں۔ اہل سنت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان کتب میں ضعیف احادیث نہیں پائی جاتی ہیں کیونکہ ان کے مصنفین نے سند کے معاملے میں انتہا درجے کی احتیاط سے کام لیا ہے۔ ان کی ایک اقلیت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان کتب میں گنتی کی چند احادیث ایسی ہیں جن کی سند میں کلام کیا جا سکتا ہے اور درایت کے اعتبار سے ان پر تنقید کی جا سکتی ہے۔ ان کے علاوہ اہل سنت کے ہاں حدیث کے سینکڑوں مجموعے ہیں جن میں ترمذی (209-279/824-892)، ابو داؤد (202-275/817-889)، نسائی (214-303/829-915)، ابن ماجہ (209-273/824-887)، احمد بن حنبل (164-241/780-855)، اور حاکم (321-403/933-1012) کی کتب زیادہ مشہور ہیں۔ اہل سنت کے نزدیک ان کتب میں صحیح، ضعیف اور جعلی ہر قسم کی احادیث موجود ہیں جنہیں قبول کرنے سے پہلے ان کی چھان بین کرنا ضروری ہے۔

اہل تشیع کے نزدیک قرآن مجید کے بعد سب سے مستند کتاب "نہج البلاغہ" ہے جو کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خطبات ہیں۔ ان خطبات کو سید شریف رضی (359-406/970-1015) نے مرتب کیا۔ اس کے علاوہ حدیث کی چار کتب ان کے ہاں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں جنہیں "اصول اربعہ" کہا جاتا ہے۔ ان میں سب سے مستند مجموعہ "الکافی" ہے جس کے مصنف شیخ الکلینی (c. 250-329/864-940) ہیں۔ صحیح بخاری و مسلم کی طرح اس کتاب کے بارے میں اہل تشیع کا یہ دعوی نہیں ہے کہ اس میں تمام احادیث صحیح ہیں بلکہ وہ "الکافی" میں ضعیف احادیث کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ اصول اربعہ میں مزید دو کتب شیخ صدوق (c. 306-381/918-991) کی تصانیف ہیں اور ایک مجموعہ ابو جعفر الطوسی (385-460/995-1067) کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ اہل تشیع کے نزدیک ان کتب میں صحیح و ضعیف ہر قسم کی احادیث موجود ہیں جن کی چھان بین کرنا ضروری ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اہل سنت اور اہل تشیع کی ان کتب میں ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف احادیث پائی جاتی ہوں۔ ان میں سے بہت سی احادیث مشترک ہیں مگر ایسی احادیث بھی ہیں ایک دوسرے سے متضاد تصویر پیش کرتی ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے راویوں سے احادیث لیتے رہے ہیں۔ اہل سنت کی کتابوں کے بہت سے راوی شیعہ اور شیعہ کتب کے بہت سے راوی سنی ہیں۔ یہ بظاہر اوپر بیان کردہ اصول سے متضاد محسوس ہوتا ہے لیکن بہت مرتبہ اصولوں کی پوری پابندی نہیں کی جاتی ہے۔ پھر پہلی صدی ہجری میں چونکہ شیعہ سنی تقسیم بہت واضح نہیں تھی، اس وجہ سے دونوں مسالک کی کتب میں ایک دوسرے کے راویوں سے احادیث قبول کی گئی ہیں۔ بعض راویوں کے بارے میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ سنی تھے یا شیعہ۔ اہل سنت شیعہ حضرات سے بحث کرتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لئے شیعہ کتب سے احادیث پیش کرتے ہیں۔ یہی معاملہ شیعہ حضرات اہل سنت کی کتب سے کرتے ہیں۔

اہل سنت کے ہاں یہ اصول موجود ہے کہ اگر حدیث کا راوی شیعہ ہو اور حدیث اہل تشیع کے نقطہ نظر کو ثابت کر رہی ہو تو ایسی حدیث مستند اور صحیح نہیں ہوتی بلکہ یہ ضعیف یا موضوع (جعلی) ہوتی ہے۔ کچھ ایسا ہی اصول اہل تشیع کے ہاں بھی موجود ہے کیونکہ ان کے نزدیک غیر شیعہ راویوں کی بیان کردہ احادیث ضعیف ہوتی ہیں۔

حدیث کے ضمن میں ایک اہم ترین اختلاف یہ بھی ہے کہ اہل تشیع کے نزدیک "ائمہ معصومین" کے فرمودات اور افعال بھی حدیث ہی کہلاتے ہیں جبکہ اہل سنت کے نزدیک حدیث کی اصطلاح صرف اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور افعال کا نام ہے۔ صحابہ و تابعین سے متعلق روایات کو اہل سنت "آثار" کا نام دیتے ہیں اور انہیں حجت شرعی قرار نہیں دیتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع تو اہل سنت کے نزدیک سنت ہے مگر کسی انفرادی صحابی کی رائے حجت نہیں ہے۔ اس کے برعکس اہل تشیع کے نزدیک ائمہ معصومین کے ارشادات حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل ہم اگلے سبق میں "مسئلہ امامت" کے عنوان کے تحت بیان کریں گے۔

اسائنمنٹ

1. اہل سنت اور اہل تشیع کی حدیث کی کتب کی ایک فہرست تیار کیجیے اور انٹرنیٹ پر انہیں تلاش کر کے انہیں ڈاؤن لوڈ کیجیے۔
2. اہل سنت کی چھ کتابیں جو صحاح ستہ کے نام سے مشہور ہیں انکے نام مصنفین کے ساتھ لکھئے۔
3. شیعہ حضرات کی چار احادیث کی کتب کا نام مصنفین کے ساتھ لکھئے
4. سنی حضرات کے نزدیک کیا صحابہ کی رائے اور عمل حجت ہے؟ نیز اسے اصطلاح میں کیا کہتے ہیں؟ اس کے مقابلے میں اہل تشیع کے ہاں ائمہ معصومین کے اقوال و افعال کی کیا اہمیت ہے؟

تعمیر شخصیت اپنے رب سے ملاقات کیجیے۔ نماز محض جسمانی ورزش نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالی سے ملاقات ہے۔

[1] ہدایۃ المحدثین بحوالہ: محمد یعقوب کلینی (c. 250-329/864-940)۔ **اصول الکافی**۔ اردو ترجمہ: سید ظفر حسن نقوی امروہوی۔ کراچی: ظفر شمیم پبلیکشنز ٹرسٹ۔ مقدمہ۔ ص 15

[2] محمود طحان۔ ترجمہ: محمد مبشر نذیر۔ **تیسیر مصطلح الحدیث**۔ http://www.mubashirnazir.org/ER/Hadith/L0004-00-Hadith.htm

سبق 3: مسئلہ امامت

اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین سب سے بڑا اختلاف "مسئلہ امامت" میں ہے۔ امام کا مطلب ہے لیڈر۔ یہ لفظ سیاسی اور مذہبی دونوں قسم کے لیڈروں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ اہل تشیع اس ضمن میں ایک خاص نقطہ نظر کے حامل ہیں جو کہ اہل سنت کے نقطہ نظر سے مختلف ہے۔

فریقین کے نقطہ ہائے نظر

اہل تشیع کا نقطہ نظر

اہل تشیع کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے خود پر لازم کر لیا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے ہر دور میں ایک معصوم "امام" کا تعین کرے جو دینی اور سیاسی معاملات میں امت کی راہنمائی کرے۔ اس امام کا سیدنا علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کی اولاد میں سے ہونا ضروری ہے۔ تمام لوگوں پر لازم ہے کہ وہ امام کی اطاعت کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو سخت گناہ گار ہوں گے کیونکہ امام کے فرمودات خدا کے حکم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ امام اللہ تعالی کی جانب سے مامور ہوتا ہے، اس وجہ سے کسی شخص کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ امام کو معزول کر سکے۔ مقام امامت کو بیان کرتے ہوئے ایران کے مشہور شیعہ مفسر آیت اللہ مکارم شیرازی صاحب (b. 1924) لکھتے ہیں:

> امامت کے مختلف معانی بیان کیے جاتے ہیں:
>
> 1۔ امامت کا معنی ہے صرف دنیاوی امور میں لوگوں کی قیادت و پیشوائی (جیسا کہ اہل سنت کہتے ہیں۔)
>
> 2۔ امامت کا معنی ہے امور دین و دنیا میں پیشوائی (اہل سنت ہی میں بعض اس کے قائل ہیں۔)
>
> 3۔ امامت کا معنی ہے دینی پروگراموں کا ثابت ہونا جس میں حدود احکام الہی کے اجراء کے لئے حکومت کا وسیع مفہوم شامل ہے۔ اسی طرح ظاہری اور باطنی پہلوؤں سے نفوس کی تربیت و پرورش بھی امامت کے مفہوم میں داخل ہے۔
>
> تیسرے معنی کے لحاظ سے یہ مقام رسالت و نبوت سے بلند تر ہے کیونکہ نبوت و رسالت خدا کی طرف سے خبر دینا، اس کا فرمان پہنچانا اور خوشخبری دینا اور تنبیہ کرنا ہے لیکن منصب امامت میں ان امور کے ساتھ ساتھ اجرائے احکام اور نفوس کی ظاہری و باطنی تربیت بھی شامل ہے۔ (البتہ واضح ہے کہ بہت سے پیغمبر مقام امامت پر بھی فائز تھے)۔ درحقیقت مقام امامت دینی منصوبوں کو عملی شکل دینے کا نام ہے۔[1]

اہل تشیع کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بہت سے انبیاء نبوت و رسالت کے ساتھ امامت کے منصب پر بھی فائز ہوئے جیسے سیدنا ابراہیم علیہ الصلوۃ

والسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ آپ پر نبوت ورسالت تو ختم ہو گئی مگر امامت کا سلسلہ جاری رہا جس کی ترتیب یہ ہے:

1. آپ کے بعد پہلے امام سیدنا علی رضی اللہ عنہ (599-661/40H) تھے۔ آپ کے دور میں امامت اور ظاہری خلافت ایک شخص میں اکٹھی ہو گئی۔ اس کے بعد یہ امامت آپ کے بیٹوں کو منتقل ہوئی۔
2. حضرت حسن رضی اللہ عنہ (3-49/625-669)
3. حضرت حسین رضی اللہ عنہ (4-61/626-680) اس کے بعد امامت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں منتقل ہوئی۔
4. علی بن حسین زین العابدین (38-95/659-712)
5. محمد باقر (57-114/676-733)
6. جعفر الصادق (83-148/702-765) رحمۃ اللہ علیہم

اس کے بعد اہل تشیع کے مختلف گروہوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اثنا عشری شیعہ جو اکثریت میں ہیں، کے نزدیک اگلے ائمہ یہ ہیں:

7. موسی کاظم (128-183/745-799) بن جعفر الصادق
8. رضا (153-203/765-818) بن موسی کاظم
9. تقی (195-220/811-835) بن رضا
10. نقی (c. 212-254/827-868) بن تقی
11. حسن عسکری (232-260/846-874) بن نقی تھے۔ رحمۃ اللہ علیہم۔
12. امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے امام مہدی بارہویں امام تھے جو کہ بچپن میں غائب ہو گئے تھے اور ان کا ظہور قیامت کے نزدیک ہو گا۔ اہل تشیع کے نزدیک ان کی تاریخ ولادت 255/869 تھی۔

بارہ اماموں کی نسبت سے اس گروہ کو "اثنا عشری "یعنی بارہ ائمہ کے ماننے والے کہا جاتا ہے۔ اہل تشیع کے نزدیک امامت نص سے ثابت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک امام اپنی وفات سے پہلے دوسرے امام کو صریح الفاظ میں اپنا جانشین مقرر کر دیتا ہے۔

امام مہدی کی عدم موجودگی میں امامت کے فرائض کون سر انجام دے۔ اس ضمن میں اہل تشیع کے دو گروہ ہیں: اقلیتی گروہ اخباری شیعوں کا ہے جن کے نزدیک اب ہدایت صرف قرآن و حدیث اور اقوال ائمہ ہی سے ملے گی۔ اکثریتی گروہ اصولی شیعوں کا ہے جن کے مطابق، اہل تشیع کے علماء ان کے جانشین کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس نظریے کو "ولایت فقیہ "کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ ان علماء کے

مختلف درجات ہیں جن میں سب سے بلند مرجع تقلید اور آیت اللہ العظمی کا ہے۔

اہل تشیع کا دوسرا بڑا فرقہ "اسماعیلی" ہیں جن کے نزدیک ساتویں امام اسماعیل بن جعفر الصادق (103-138/721-755) تھے جن کے بعد امامت ان کی نسل کو منتقل ہوئی اور ان کی نسل میں آج تک امام چلے آ رہے ہیں۔ اسماعیلیوں کے علاوہ تاریخ میں ایسے متعدد شیعہ فرقے پیدا ہوئے جنہوں نے اوپر بیان کردہ ائمہ کی بجائے کچھ اور افراد کو امام مانا۔ ان میں زیدی اور علوی شامل ہیں۔ ان سب کی تفصیل کا مطالعہ ہم اگلے اسباق میں کریں گے۔

اہل تشیع کے نزدیک مسئلہ امامت اصول دین میں سے ہے۔ مشہور شیعہ عالم ملا باقر مجلسی (1025-1109/1616-1698)، جو کہ اہل تشیع کے علماء میں بہت بلند مقام کے حامل ہیں۔ لکھتے ہیں:

> "شیعوں کے نزدیک امام کا اقرار اصول دین میں سے ہے اور اس کا ترک کرنے والا احکام آخرت میں کافروں کے ساتھ شریک ہے اور احکام دنیوی میں مسلمانوں کی طرح ان سے برتاؤ کیا جاتا ہے مگر جو لوگ کہ اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ دشمنی ظاہر کرتے ہیں مثل خوارج کے تو وہ لوگ احکام دنیوی میں بھی کفار کا حکم رکھتے ہیں۔
>
> بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام برحق کے غلبہ نہ ہونے کے زمانہ میں شیعوں پر شفقت کے لئے ان [یعنی اہل سنت] پر حکم اسلام ظاہراً جاری کیا ہے تا کہ ان کے ساتھ معاشرت میں دشواری نہ ہو اور حضرت صاحب الامر علیہ السلام [امام مہدی] کے ظہور کے بعد ان پر صرف کفار کا حکم جاری ہو گا۔ اور اکثر علمائے شیعہ کا یہ اعتقاد ہے کہ سوائے ضعیف الاعتقاد والوں کے سب کے سب مثل تمام کافروں کے ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہیں گے اور علمائے شیعہ میں سے شاذ و نادر کوئی اس کا قائل ہوا ہے کہ عذاب الٰہی میں طویل مدت تک رہنے کے بعد ان کی نجات کی امید ہے۔ اور مستضعف [کمزور اعتقاد والا] وہ ہے جو ضعف عقل کے سبب حق و باطل میں تمیز نہ کر سکے یا یہ کہ مذہب حق کی حقانیت کی دلیل باوجود عدم تقصیر [بغیر کوتاہی کے] کے اس پر تمام نہ ہوئی ہو۔ مثل ان لوگوں کے جنہوں نے سنی بادشاہوں کے محل میں نشو و نما پائی ہو اور مذہب کے اختلاف کو نہ سنا ہو اور کسی کو نہ پایا ہو جو مذہب شیعہ کی حقیت [حقانیت] ان پر ثابت کرتا۔ ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں نجات کی امید ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سوائے مستضعفین کے عذاب الٰہی سے نجات کی امید نہیں ہے۔ وہ عذاب الٰہی میں ہمیشہ رہیں گے۔"[2]

ملا مجلسی کے اس اقتباس کے برعکس عام شیعہ، اہل سنت کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں اور "اتحاد بین المسلمین" کے علمبردار ہیں۔ جدید شیعہ علماء جیسے آیت اللہ خمینی اور علامہ مکارم شیرازی نے اپنی مشہور تفسیر "تفسیر نمونہ" میں اسی پر زور دیا ہے۔

اہل سنت کا نقطہ نظر

اہل سنت کا نظریہ اہل تشیع کے برعکس ہے۔ ان کے نقطہ نظر کے مطابق اللہ تعالی نے خود پر نہیں بلکہ امت مسلمہ پر یہ لازم کیا ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک امام کا انتخاب کر لیں جو ان کے معاملات کو چلا سکے۔ یہ امام سیاسی حکمران ہوتا ہے نہ کہ دینی راہنما۔ اس امام کا اولاد علی یا کسی اور خاص نسل میں سے ہونا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ وہ معصوم عن الخطاء ہو۔ وہ ایک عام انسان ہوتا ہے جس

پر تنقید بھی کی جا سکتی ہے، اس کا احتساب بھی کیا جا سکتا ہے اور اسے معزول بھی کیا جا سکتا ہے۔ امام کے فرمودات کوئی دینی درجہ نہیں رکھتے، ان کی اطاعت اسی صورت میں ہو گی جب وہ قرآن و سنت کے مطابق ہوں یا کم از کم مخالف نہ ہوں۔ اگر امام کا حکم قرآن و سنت سے متصادم ہو تو اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ امام کا حکمران مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہو گا اور حکومت کے معاملات بھی مسلمانوں کے باہمی مشورے سے چلائے جائیں گے۔

جہاں تک دینی راہنما کا تعلق ہے تو اسے بھی امام کہا جا سکتا ہے مگر اس کی بات حجت کا درجہ نہیں رکھتی۔ اس کی بات کو قرآن و سنت کے دلائل پر پرکھا جائے گا، اگر بات ان کے مطابق ہو گی تو مان لیا جائے گا ورنہ مسترد کر دیا جائے گا۔ دینی راہنما بھی معصوم نہیں ہو سکتا۔ اس سے اختلاف رائے کیا جا سکتا ہے اور اس رائے پر تنقید بھی کی جا سکتی ہے۔

نظریہ امامت سے متعلق اہل تشیع کے دلائل

دونوں فریق تمام اختلافی مسائل میں اپنے اپنے نقطہ نظر کی بنیاد اپنی اپنی کتب حدیث میں موجود احادیث پر رکھتے ہیں ۔ اب چونکہ اہل سنت کے نزدیک اہل تشیع کی کتب حدیث مستند نہیں ہیں اور اہل تشیع کے نزدیک، اہل سنت کی احادیث کی کتابیں نا قابل اعتماد ہیں، اس وجہ سے یہ احادیث پیش کرنے کا فائدہ نہیں ہے۔ ایک غیر جانبدار مبصر تو انہی مآخذ سے دلائل پر مطمئن ہو سکتا ہے جسے دونوں فریق قابل اعتماد مانتے ہوں۔ اس معاملے میں فریقین پر حجت انہی مآخذ سے قائم ہو سکتی ہے:

- قرآن مجید: اس کی حجیت میں سنی اور شیعہ متفق ہیں۔
- اہل سنت کی کتب کی وہ احادیث جنہیں اہل سنت مستند مانتے ہوں اور اہل تشیع انہیں اپنے نقطہ نظر کے حق میں پیش کرتے ہیں۔
- اہل تشیع کی کتب کی وہ احادیث، جنہیں اہل تشیع مستند مانتے ہوں اور اہل سنت انہیں اپنے نقطہ نظر کے حق میں پیش کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ کہ اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کی کتب میں ایسی احادیث موجود ہیں جنہیں وہ خود ضعیف یا موضوع (جعلی) سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر کوئی سنی، شیعہ کتب میں سے ان کی کوئی ضعیف حدیث پیش کرے یا پھر کوئی شیعہ، اہل سنت کی کتابوں سے کوئی نا قابل اعتماد حدیث پیش کرے تو یہ کوئی معقول بات نہیں ہے اور نہ ہی حجت بن سکتی ہے۔ قرآن مجید کے ضمن میں ان کے ہاں تعبیر و تشریح کا اختلاف ہو سکتا ہے جسے دور کرنے کے لیے متعلقہ آیات کا سیاق و سباق دیکھنا ضروری ہے۔

اب ہم مسئلہ امامت سے متعلق اہل تشیع اور اہل سنت کے دلائل کو تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔ چونکہ اس معاملے میں دعوی اہل تشیع

کی جانب سے ہے، اس وجہ سے دلائل فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی انہی کی ہے۔ اہل سنت چونکہ شیعہ حضرات کے عقیدہ امامت سے اختلاف رکھتے ہیں، اس وجہ سے وہ دلائل پیش نہیں کرتے بلکہ شیعہ حضرات کے دلائل کا محض جواب دیتے ہیں۔

یہاں ہم ملا باقر مجلسی کی کتاب "اثبات امامت" سے ان کے دلائل کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ سید بشارت حسین کامل مرزا پوری نے کیا ہے اور مجلس علمی اسلامی پاکستان نے اسے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم مکارم شیرازی صاحب کی تفسیر نمونہ سے بھی دلائل پیش کریں گے۔ ان دلائل کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: قرآن، حدیث اور عقل۔

قرآن سے دلائل

عقیدہ امامت کے اثبات میں شیعہ حضرات قرآن مجید کی جو آیات پیش کرتے ہیں، انہیں ہم ان عنوانات کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں: امامت ابراہیمی، اولوا الامر کی اطاعت، آیت تبلیغ، آیت تطہیر اور امام کے نصب کی ہدایت۔

1۔ امامت ابراہیمی

وَإِذْ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ.

جب ابراہیم کو ان کے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا تو انہوں نے انہیں پورا کر دیا۔ فرمایا: "میں تمہیں دنیا کے لوگوں کے لئے امام بناؤں گا۔" انہوں نے عرض کیا: "اور میری اولاد میں سے؟" فرمایا: "میرا عہد ظالم لوگوں کے لئے نہیں ہے۔" (البقرۃ 2:124)

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً وَكُلاًّ جَعَلْنَا صَالِحِينَ. وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَةِ الصَّلاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ.

مزید بر آں، ہم نے انہیں اسحاق اور یعقوب عطا کیے۔ ان سب کو ہم نے صالح بنایا۔ ہم نے انہیں امام مقرر کیے جو ہمارے معاملے کی جانب ان کی راہنمائی کرتے تھے۔ ہم نے ان کی جانب وحی کی کہ وہ نیکی کے کام کریں، نماز قائم کریں، زکوۃ ادا کریں اور ہمارے بندے بن کر رہیں۔ (الانبیاء 21:72-73)

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِنْ لِقَائِهِ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِبَنِي إِسْرَائِيلَ. وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ.

ہم نے موسی کو کتاب عطا کی۔ تم اس سے ملاقات میں شک نہ کرنا۔ ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لئے ہدایت بنایا اور جب انہوں نے صبر کیا تو ہم نے ان میں ایسے امام بنائے جو انہیں ہمارے معاملے کی جانب راہنمائی کیا کرتے تھے۔ وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔ (السجدۃ 32:23-24)

اہل تشیع کہتے ہیں کہ ان آیات کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ امامت کا منصب نبوت و رسالت سے ہٹ کر ہے جو کہ اللہ تعالی نے اپنے بندوں کو عطا کیا۔

اہل سنت اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک ان آیات کا سیاق وسباق یہ بیان کرتا ہے کہ امامت کوئی منصب نہیں ہے بلکہ یہ ایک دینی فریضہ ہے جس کا مطلب ہوتا ہے لوگوں کی راہنمائی کرنا۔ یہ راہنمائی نبی بھی کر سکتے ہیں اور عام علماء بھی اور اس میں اللہ تعالی کی جانب سے مقرر ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔ اس کے برعکس نبوت ایک منصب ہے جس کے لیے اللہ تعالی کی جانب سے مقرر ہونا ضروری ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان آیات سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی لیڈروں کو نیکی کی طرف بلانا چاہیے اور نماز و زکوۃ کو قائم کرنا چاہیے۔ لیکن امام کا ہر قسم کی خطا سے معصوم ہونا اور اللہ تعالی کی جانب سے مقرر کیا جانا ان آیات سے کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔

اہل سنت مزید یہ کہتے ہیں کہ اگر عقیدہ امامت دین کے اصول میں سے ہوتا تو اسے قرآن میں واضح الفاظ میں اس درجے میں بیان کر دیا جاتا جس درجے میں ہمیں قرآن میں مثلاً توحید، آخرت اور رسالت پر گفتگو ملتی ہے۔ جیسے اس باب میں دو آراء کا ہونا ممکن نہیں ہے کہ قرآن توحید کا علمبردار ہے یا شرک کا، یہ آخرت کی زندگی کی تبلیغ کرتا ہے یا نہیں، بالکل اسی طرح اگر ائمہ معصومین کی امامت کا عقیدہ دین کا اساسی عقیدہ ہوتا تو پھر قرآن میں اس مسئلے کو اتنی تفصیل سے بیان کر دیا جاتا کہ پھر کسی اختلاف کی گنجائش ہی باقی نہ رہتی۔ چونکہ ایسا نہیں ہے، اس وجہ سے کسی طور پر بھی عقیدہ امامت کو دین کا بنیادی عقیدہ سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

اہل تشیع کا ایک چھوٹا سا گروہ اس ضمن میں یہ کہتا ہے کہ قرآن مجید کا ایک حصہ جس میں امامت کے عقیدہ کا بیان تھا، ضائع کر دیا گیا ہے۔ اس میں سورۃ علی، سورۃ حسنین اور سورۃ فاطمہ تھی۔ اس نظریے کا خود اہل تشیع کی غالب اکثریت نے رد کیا ہے اور اس بات کا سختی سے اثبات کیا ہے کہ قرآن میں کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے اور یہ کامل اور محفوظ ہے۔

2۔ اولو الامر کی اطاعت

اہل تشیع اپنے نقطہ نظر کے ثبوت میں یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ.

اے اہل ایمان! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے معاملات کو چلانے والوں کی بھی۔ اگر کسی معاملے میں تمہارے مابین اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ (النساء 4:59)

اہل تشیع بالاتفاق اس آیت میں "اولو الامر" سے مراد ائمہ اہل بیت کو سمجھتے ہیں جو ان کے نزدیک معصوم ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں مکارم شیرازی صاحب لکھتے ہیں:

تمام شیعہ مفسرین اس سلسلے میں ایک متفق نظریہ رکھتے ہیں کہ اولو الامر سے مراد ائمہ معصومین ہیں۔ جن کو تمام امور زندگی میں اسلامی معاشرے کی مادی اور روحانی رہنمائی خدا اور پیغمبر کی طرف سے سپرد کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ یہ لفظ کسی پر صادق نہیں آتا۔ البتہ ایسے لوگ جو

ان کی طرف سے کسی مرتبے یا عہدے کے لئے مقرر کیے جائیں اور اسلامی معاشرے کے کسی عہدہ پر فائز ہوں تو معینہ شرائط کے ساتھ ان کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ لیکن یہ اس لحاظ سے نہیں کہ وہ اولوا الامر ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اولوا الامر کے نمائندے ہیں۔۔۔۔[3]

اہل سنت کہتے ہیں کہ اس آیت میں "اولوا الامر" کی اطاعت کا حکم تو ہے مگر یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ ان سے اختلاف رائے ہو سکتا ہے اور ایسی صورت میں معاملے کو اللہ اور اس کے رسول کی جانب لوٹا دینا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "اولوا الامر" کوئی ایسی ہستی ہے، جس سے اختلاف رائے جائز ہے اور اگر اولوا الامر معصوم ہوتا تو اس سے اختلاف جائز نہ ہوتا۔ اولوا الامر سے اختلاف رائے کا جائز ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ معصوم عن الخطاء نہیں ہے۔

اہل سنت کی اس دلیل کے جواب میں شیرازی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ یہ ہے:

اگر واقعی اولوا الامر سے مراد معصوم امام اور رہبر ہیں تو پھر کیوں مسلمانوں کے اختلاف اور جھگڑے کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "اگر کسی چیز میں اختلاف پڑ جائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو۔ اگر تم خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بھی بہت ہی اچھا ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہاں اولوا الامر کا ذکر نہیں ہے اور اختلاف کو دور کرنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، وہ خدا کی کتاب اور حضرت رسول اکرم کی سنت ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض صرف شیعہ علماء کی تفسیر پر نہیں ہے بلکہ ادنی تامل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ دوسری تفاسیر پر بھی اس کی زد پڑتی ہے۔ یعنی یہ اعتراض اہل سنت کی تفاسیر پر بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں شک نہیں کہ مندرجہ بالا جملے میں اختلاف و تنازع سے مراد احکام میں اختلاف ہے نہ کہ ان مسائل سے جن کا تعلق حکومت و رہبری کی جزئیات سے ہے کیونکہ ان مسائل میں تو لازماً اولوا الامر کی اطاعت کرنا ہو گی جیسا کہ آیت کے پہلے جملے میں وضاحت ہو چکی ہے۔ اس بنا پر اختلاف سے مراد اسلام کے احکام اور قوانین کلی کا اختلاف ہے جن کی تشریع خدا اور پیغمبر سے متعلق ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ امام تو احکام جاری کرنے والے ہیں نہ کہ قانون وضع کرنے اور منسوخ کرنے والے۔ امام تو ہمیشہ خدا کے احکام اور سنت رسول کے اجرا کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ اسی لیے احادیث اہل بیت میں ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص کوئی بات کتاب خدا اور حدیث پیغمبر کے خلاف نقل کرے تو اسے ہرگز قبول نہ کرو کیونکہ یہ ناممکن اور محال ہے کہ ہم کتاب خدا اور سنت پیغمبر کے خلاف کچھ کہیں۔ اسی لیے احکام و قوانین اسلامی میں لوگوں کے اختلافات دور کرنے کا پہلا مرجع خدا اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جن پر وحی خدا نازل ہوتی ہے۔ اب اگر ائمہ معصومین احکام بیان کرتے ہیں تو وہ خود ان کی طرف سے نہیں ہیں بلکہ وہ کتاب خدا یا اس علم سے ہیں جو حضرت رسالت مآب کی طرف سے ان تک پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولوا الامر کا لفظ اختلافی احکام و مسائل کے حل کرنے والوں میں شامل نہیں ہے۔[4]

شیرازی صاحب کی اس بات کے جواب میں اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ آیت کریمہ میں **فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ** کے الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اگر اولوا الامر سے اس معاملے میں اختلاف ہو جائے تو معاملے کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور رسول سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا ہے مگر اولوا الامر سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ جس سے

اختلاف رائے کیا جا سکے، وہ معصوم نہیں ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ معاملے کے اللہ اور رسول کی جانب دینی مسائل ہی میں لوٹایا جا سکتا ہے۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ اگر آیت کریمہ میں اولوا الامر سے مراد امام معصوم ہوتی اور اختلاف کا تعلق لوگوں کے باہمی اختلاف سے ہوتا تو پھر معاملے کو امام معصوم کی طرف لوٹائے جانے کا حکم ہوتا نہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی جانب۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک زندہ امام لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ فوراً کر سکتا ہے جبکہ اللہ اور رسول کی طرف معاملے کو لوٹائے جانے میں قرآن و سنت سے تفصیلی دلائل دینا ہوں گے اور قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر (Interpretation) کا اختلاف بھی ممکن ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسی زندہ جاوید ہستی موجود ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے، تو پھر اختلافات کا فوری فیصلہ ہو جائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی زندہ امام کی طرف لوٹنے کی بجائے حکم دیا ہے کہ معاملے کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اولوا الامر سے مراد امام معصوم ہو ہی نہیں سکتا اور اولوا الامر سے اختلاف رائے جائز ہے۔

3۔ آیت تبلیغ

اہل تشیع اپنے نقطہ نظر کے حق میں قرآن مجید کی یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنْ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ.

اے رسول! جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل ہوا ہے، اسے پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اس کی رسالت کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا، یقیناً اللہ کفر کرنے والی قوم کو ہدایت نہیں دیتا ہے۔ (المائدہ 5:67)

شیعہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منصب امامت کا اعلان کر دیں اور اس بات کی پرواہ نہ کریں کہ لوگ اس کی مخالفت کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو گارنٹی دی ہے کہ وہ آپ کی اس معاملے میں حفاظت فرمائے گا۔

اس کے جواب میں اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ کسی بھی کتاب کی کسی بھی عبارت کو سمجھنے کا اصول یہ ہے کہ اسے اس کے سیاق و سباق کی روشنی میں سمجھا جائے۔ اس آیت کریمہ میں کہیں بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ذکر نہیں ہے بلکہ سیاق و سباق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دین کی عمومی دعوت مراد ہے۔ پورا سیاق یہ ہے:

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ (65) وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ (66) يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ

وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنْ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (67) قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَى شَيْءٍ حَتَّى تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيراً مِنْهُمْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَاناً وَكُفْراً فَلا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (68)

اگر یہ اہل کتاب ایمان لے آتے اور تقوی اختیار کرتے تو ہم ان کے گناہوں کو مٹا کر انہیں ضرور ضرور نعمتوں والی جنتوں میں داخل کر دیتے۔ اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھتے اور اس [قرآن] کو جو ان کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا، تو اپنے اوپر اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔ ان میں ایک گروہ اعتدال پسند ہے اور ان میں اکثر برے اعمال کرنے والے ہیں۔ اے رسول! جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل ہوا ہے، اسے پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اس کی رسالت کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا، یقیناً اللہ کفر کرنے والی قوم کو ہدایت نہیں دیتا ہے۔ آپ فرما دیجیے! "اے اہل کتاب! تم کسی چیز پر نہیں جب تک کہ تم تورات اور انجیل کو قائم نہ رکھو اور اس [قرآن] کو جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے نازل ہوا ہے۔" جو آپ کے رب نے آپ پر نازل فرمایا ہے، اس سے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر میں اضافہ ہو جائے گا، تو آپ ایسی کافر قوم پر افسوس زدہ نہ ہو جایئے۔ (المائدہ)

اہل سنت کہتے ہیں کہ آیت تبلیغ کا سیاق و سباق بتاتا ہے کہ یہاں معاملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا نہیں بلکہ اہل کتاب کو دعوت دینے کا ہے اور اسی کی تبلیغ کا بیان ہے۔ آخر اللہ تعالی کو کیا غرض لاحق تھی کہ وہ اہل کتاب کو دعوت دیتے دیتے، درمیان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کا اعلان کرنے کا بغیر نام لیے حکم دے دیتا اور پھر دوبارہ اہل کتاب کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

4۔ آیت تطہیر

اہل تشیع اپنے نقطہ نظر کے حق میں یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمْ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيراً.

اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ اے اہل بیت! آپ لوگوں سے غلاظت کو دور کر کے آپ کو اچھی طرح پاک فرما دے۔ (الاحزاب 33:34)

اہل تشیع کا استدلال یہ ہے کہ آیت کریمہ میں اہل بیت سے ہر قسم کی جسمانی و اخلاقی غلاظت نجاست دور کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے، تو پھر ان سے بڑھ کر کون امامت کا مستحق ہے۔ ان کے نزدیک اہل بیت سے مراد سیدنا علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم ہیں۔

اس کے جواب میں اہل سنت کا کہنا یہ ہے کہ آیت کریمہ کا سیاق و سباق یہ واضح کرتا ہے کہ یہاں زیر بحث امہات المومنین رضی اللہ عنہن ہیں اور زیر بحث معاملہ خلافت و امامت کا نہیں بلکہ کچھ اور ہے:

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنْ النِّسَاءِ إِنْ اتَّقَيْتُنَّ فَلا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلاً مَعْرُوفاً. وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمْ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيراً. وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفاً خَبِيراً.

اے ازواج نبی! آپ عام خواتین کی طرح نہیں ہیں۔ اگر آپ محتاط رہیں تو اپنی بات نرم اور لوچ دار انداز میں نہ کیجیے تاکہ جس کے دل میں مرض ہے، وہ کسی غلط فہمی میں نہ پڑ جائے۔ ان سے خوش اسلوبی سے بات کیجیے۔ اپنے گھروں میں ٹھہری رہیے اور پہلی جاہلیت کی سی سج دھج سے پرہیز کیجیے۔ نماز قائم کیجیے، زکوۃ دیجیے اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کیجیے۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ اے اہل بیت! آپ لوگوں سے غلاظت کو دور کر کے آپ کو اچھی طرح پاک فرما دے۔ آپ کے گھروں میں جو اللہ کی آیات اور حکمت کی باتیں پڑھی جاتی ہیں، ان کی یاد دہانی کرتی رہیے۔ یقیناً اللہ بہت باریک بینی سے باخبر ہے۔ (الاحزاب 33:32-34)

اہل سنت کا کہنا یہ ہے کہ اس آیت تطہیر کا سیاق و سباق یہ بتا رہا ہے کہ اصلاً امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی تعلیم و تربیت کے لیے نازل ہوئی۔ ضمنی طور پر اس کا اطلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں، دامادوں، نواسے نواسیوں اور خاندان کے دیگر ارکان پر بھی ہوتا ہے مگر یہاں زیر بحث معاملہ امامت و خلافت نہیں بلکہ تعلیم و تربیت ہے۔

اس کے جواب میں اہل تشیع، اہل سنت کی کتب سے ایک حدیث پیش کرتے ہیں جو "حدیث الکساء" کہلاتی ہے۔ یہ حدیث اہل تشیع کی کتب میں تو بہت تفصیل سے آئی ہے البتہ اہل سنت کی کتب میں صرف ترمذی نے اسے روایت کیا ہے۔ حدیث کچھ یوں ہے:

حدثنا قتيبة حدثنا محمد بن سليمان الأصبهاني عن يحيى بن عبيد عن عطاء بن أبي رباح عن عمر بن أبي سلمة ربيب النبي صلى الله عليه وسلم قال لما نزلت هذه الآية على النبي صلى الله عليه وسلم { إنما يريد الله ليذهب عنكم الرجس أهل البيت ويطهركم تطهيرا } في بيت أم سلمة فدعا فاطمة وحسنا وحسينا فجللهم بكساء وعلي خلف ظهره فجللهم بكساء ثم قال اللهم هؤلاء أهل بيتي فأذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهيرا قالت أم سلمة وأنا معهم يا نبي الله قال أنت على مكانك وأنت على خير قال هذا حديث غريب من حديث عطاء عن عمر بن أبي سلمة.

عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما، جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوتیلے بیٹے ہیں، کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی: "اے اہل بیت! اللہ کا ارادہ تو بس یہ ہے کہ گندگی کو تم سے دور کر دے اور تمہیں پاکیزہ کر دے۔" تو آپ اس وقت سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے۔ آپ نے سیدہ فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور انہیں چادر کے اندر کر لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے تھے، آپ نے پر بھی چادر ڈال دی۔ پھر عرض کیا: "اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں، ان سے غلاظت کو دور فرما دے اور انہیں اچھی طرح پاک فرما دے۔" ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: "کیا میں ان کے ساتھ ہوں؟ اے اللہ کے نبی!" فرمایا: "تم اپنی جگہ پر رہو اور تم بھلائی پر ہو۔"

ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث صرف عطاء نے عمر بھی ابی سلمہ سے روایت کی ہے۔ (ترمذی، کتاب التفسیر، حدیث 3205)

حدثنا عبد بن حميد حدثنا عفان بن مسلم حدثنا حماد بن سلمة أخبرنا علي بن زيد عن أنس بن مالك أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يمر بباب فاطمة ستة أشهر إذا خرج إلى صلاة الفجر يقول الصلاة يا أهل البيت { إنما يريد الله ليذهب عنكم الرجس أهل البيت ويطهركم تطهيرا } قال هذا حديث حسن غريب من هذا الوجه إنما نعرفه من حديث حماد بن قال وفي الباب عن أبي الحمراء ومعقل بن يسار وأم سلمة.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چھ ماہ تک عادت رہی کہ جب آپ نماز فجر کے لیے نکلتے تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر فرماتے: "اے اہل بیت! اللہ کا ارادہ تو بس یہ ہے کہ گندگی کو تم سے دور کر دے اور تمہیں پاکیزہ کر

دے۔"

ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے، اس اعتبار سے کہ ہم اسے صرف حماد بن سلمہ کی روایت سے جانتے ہیں۔ اس باب میں ابوالحمراء، معقل بن یسار اور ام سلمہ رضی اللہ عنہم کی روایات بھی ہیں۔ (ترمذی، کتاب التفسیر، حدیث 3206)

اہل سنت کا کہنا یہ ہے کہ وہ مانتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ، علی، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم اہل بیت میں داخل ہیں اور یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خاص محنت کو ظاہر کرتی ہے جو آپ نے ان حضرات کی تربیت کے لیے فرمائی۔ ان احادیث کی رو سے یہ کہیں معلوم نہیں ہوتا کہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن نعوذ باللہ اہل بیت سے خارج ہیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بیٹیاں اور داماد بھی اہل بیت سے خارج ہیں۔ ان احادیث کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کی تربیت سے ہے، نہ کہ امامت و خلافت سے۔

اہل سنت کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں فیملی یا خاندان کا تصور بہت وسیع تھا۔ اس میں صاحب خانہ کے بیوی، بچے، شادی شدہ بیٹے، بیٹیاں، داماد، بہو، ملازم، غلام اور حتی کہ آزاد کردہ غلام بھی خاندان کا حصہ سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات، بیٹیاں، داماد، غلام اور آزاد کردہ غلام سبھی اہل بیت کا حصہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے ایک موقع پر سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو اپنے اہل بیت کا حصہ قرار دیا۔ اسی طرح جن جن غلاموں کو آپ نے اپنی ذاتی دولت یا بیت المال سے خرید کر آزاد فرمایا، انہیں بھی اپنے اہل بیت میں داخل فرمایا۔

اہل تشیع سوال کرتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی چار حضرات کو چادر میں داخل کیوں فرمایا اور ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو باہر کیوں رکھا۔ اس کے جواب میں اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا انداز تھا۔ جیسا کہ دوسری حدیث سے واضح ہے کہ آپ نماز فجر کے لیے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے خاندان کو اٹھانے کے لیے چھ ماہ تک یہی آیت تلاوت فرما کر گزرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ پورا گھرانا اس درجے میں عبادت گزار بن گیا کہ ان کی راتیں اللہ تعالی کی عبادت میں گزرنے لگیں۔ رہا یہ سوال کہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو چادر مبارک میں داخل کیوں نہ کیا تو اس کے جواب میں ترمذی کے شارح مولانا عبد الرحمن مبارک پوری ان احادیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"آپ اپنی جگہ ٹھہری رہیے کیونکہ آپ خیر پر ہیں" میں اس معنی کا احتمال ہے کہ آپ خیر پر ہیں اور اپنی جگہ پر ٹھہری رہیے کہ آپ پہلے ہی میرے اہل بیت میں داخل ہیں۔ چادر کے اندر داخل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"[5]

اہل سنت مزید کہتے ہیں کہ حدیث مذکور میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور امامت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

احادیث سے دلائل

عقیدہ امامت کے اثبات میں شیعہ حضرات جو احادیث پیش کرتے ہیں، وہ ان کی اپنی کتب سے منقول ہیں۔ چونکہ یہ کتب اور ان کے راوی اہل سنت کے نزدیک قابل اعتماد نہیں ہیں، اس وجہ سے دونوں گروہ کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پاتے۔ چونکہ اس معاملے میں کوئی متفق علیہ بنیاد نہ ہونے کے باعث تقابلی مطالعہ ممکن ہی نہیں ہے، اس وجہ سے ہم اس حصے کو نظر انداز کرتے ہیں۔

بعض شیعہ علماء اس ضمن میں اہل سنت کی کتابوں سے کچھ احادیث پیش کرتے ہیں۔ یہ احادیث زیادہ تر وہ ہیں جن میں سیدنا علی، فاطمہ، حسن، حسین رضی اللہ عنہم کے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ ایک الگ اور تفصیلی موضوع ہے، اس وجہ سے ہم ان احادیث کا صحابہ و اہل بیت والے سبق میں جائزہ لیں گے۔

عقلی دلائل

عقیدہ امامت کے حق میں اہل تشیع کچھ عقلی دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے دو دلائل بہت اہمیت رکھتے ہیں جو کہ کتاب "اثبات امامت" کے شروع میں حاشیہ پر بیان کیے گئے ہیں۔

1۔ اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ انسانوں کو ہدایت کے بغیر چھوڑ دے۔ انسانوں کی ہدایت کے لئے نہ صرف کتاب اللہ بلکہ ایک زندہ امام کی ضرورت ہے جو اس کتاب کی تشریح و توضیح کر سکے۔

2۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کا ایک محافظ ہر دور میں ہونا ضروری ہے جو اس کو تحریف و تغییر اور کمی بیشی سے محفوظ رکھے۔ چونکہ قرآن کی آیتیں مجمل ہیں، اکثر احکام قرآن کے ظاہری الفاظ سے معلوم نہیں ہوتے لہذا خدا کی جانب سے ایک مفسر ہونا چاہیے جو قرآن سے احکام کا استنباط کر سکے۔

اہل سنت ان دلائل کا جواب اس دیتے ہیں:

ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ہدایت کے بغیر کبھی نہیں چھوڑا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت کے ختم ہونے کے بعد آپ کی عطا کردہ کتاب قرآن مجید ہے جو اپنی اصل حالت میں ہمارے سامنے موجود ہے اور جس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اس کتاب کی تشریح و تعبیر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جاری کردہ سنت سے ہوتی ہے جو نسلاً بعد نسلاً تواتر سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اس کے علاوہ آپ سے منسوب احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے ہے۔ اگرچہ اس میں صحیح و ضعیف ہر قسم کی احادیث شامل ہیں مگر امت کے اہل علم نے ان کی چھان بین کا ایسا طریقہ وضع کر دیا ہے جس کے ذریعے صحیح و ضعیف احادیث میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ ان سب تفصیلات کے ہوتے ہوئے زندہ امام اور مفسر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دوسرے یہ کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کا محافظ ہر دور میں ہونا ضروری ہے تو یہ بات خود اہل تشیع کے نظریہ کے

خلاف ہے کیونکہ ان کے عقیدے کی رو سے گیارہ ائمہ ہوئے اور بارہویں امام، امام مہدی روپوش ہو گئے۔ آپ قیامت کے نزدیک دوبارہ ظاہر ہوں گے۔ اگر امام صاحب غائب رہیں تو پھر کس طرح امت کی راہنمائی کر سکتے ہیں اور کیسے قرآن کی تفسیر کر سکتے ہیں؟ واضح رہے کہ یہی اعتراض اسماعیلی حضرات بھی اثنا عشری نقطہ نظر کے خلاف پیش کرتے ہیں۔ شیعہ حضرات اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ امام مہدی کا وجود روحانی اعتبار سے دنیا کو فائدہ پہنچا رہا ہے جیسے سورج کی روشنی بند کمروں میں بھی پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ کہ آپ ایک ایسی جماعت کی تربیت میں مصروف ہیں جو کہ تیار ہو کر آپ کے ظہور کے وقت آپ کا ساتھ دے گی۔[6]

تیسرے یہ کہ اگر ہر وقت دنیا میں ایک امام موجود بھی رہے، تب بھی ایسا ممکن نہیں ہے کہ وہ سب لوگوں تک اپنی دعوت پہنچا سکیں اور نہ ہی تمام انسانوں کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ہدایت حاصل کر سکیں۔

چوتھے یہ کہ اگر امامت کے عقیدے کو مان لیا جائے تو پھر عملاً ختم نبوت کا انکار بھی لازم آتا ہے۔ سنی عالم مولانا محمد حنیف ندوی (1908-1987) لکھتے ہیں:

> امام کا حضرات امامیہ کے نزدیک معصوم ہونا ضروری ہے۔ حقیقت غور طلب یہ ہے کہ معصوم امام مفترض الطاعۃ [یعنی جس کی اطاعت فرض ہو] بھی ہوتا ہے۔ اب اگر تین باتوں کو باہم ملایئے گا تو نتیجہ میں جو شے سامنے آئے گی، وہ یہ ہے کہ نبوت کے ساتھ ساتھ حضرات شیعہ کے نزدیک بالکل متوازی نظام امامت کا بھی جاری ہے۔
>
> یعنی جس طرح انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی بعثت ضروری ہے، اسی طرح ائمہ کا نصب ضروری ہے۔
>
> جس طرح انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام فکر و عمل کے اعتبار سے معصوم ہوتے ہیں، اسی طرح ائمہ اطہار کا دامن ہر طرح کی ذہنی و عملی لغزش سے پاک ہوتا ہے۔
>
> پھر جس طرح انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کو ماننا، ان پر ایمان لانا اور ان کے فیصلوں کے سامنے اطاعت کے لئے گردن جھکانا فرض ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ حضرات ائمہ کی اطاعت کی جائے اور ان کے فیصلوں کے سامنے سر جھکایا جائے۔
>
> ہو سکتا ہے کہ نبوت اور امامت میں بعض صفات کی کمی بیشی مابہ الامتیاز ہو، مگر جہاں تک نبوت کے اس تصور کا تعلق ہے جو ہر آدمی کی سمجھ میں آ سکتا ہے، اس کے یہ تین ہی بڑے بڑے اجزا ہو سکتے ہیں۔ بعثت و نصب کا وجوب، عصمت کا ہونا اور اطاعت و انقیاد [قیادت قبول کرنا] کی فرضیت۔ یعنی اللہ نے اسے بھیجا ہو، عملی زندگی پاک اور نمونے کی ہو اور اس کی اطاعت انسان پر فرض ہو اور ان تینوں باتوں میں امامت و نبوت میں اشتراک ہے۔ اب اگر ایک گروہ یہ مانتا ہے کہ ختم نبوت سے صرف اتنا ہی ہو پایا ہے کہ لفظ نبوت کا اطلاق کسی دوسرے شخص پر نہیں ہو سکے گا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک دوسرے نام سے رشد و ہدایت کا یہی سلسلہ جاری رہے گا اور اس کا ماننا اور تسلیم کرنا ہمارے لئے اتنا ہی ضروری ہو جتنا سلسلہ نبوت کا تو واقعہ و عمل کے اعتبار سے اجرائے نبوت اور اجرائے امامت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔
>
> اس کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص توحید کے یہ معنی لیتا ہے کہ کسی شخص پر لفظ "اللہ" کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کسی کو رب اور پروردگار نہیں کہہ سکتے لیکن عملاً ایسے مرکزوں سے اس کی عقیدت و محبت برابر وابستہ ہے جو اختیارات کے اعتبار سے کسی طرح بھی اللہ سے کم نہیں تو کیا آپ اسے توحید

ہی قرار دیں گے اور شرک نہیں سمجھیں گے؟ جس طرح توحید کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ غیر اللہ کے سامنے جھکنا تو جائز نہیں لیکن سجدہ کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھا جائے اور ضروریات اور مشکلات کے وقت اس کو پکارنے اور اس سے استمداد و اعانت چاہنے میں بھی کوئی گناہ نہ متصور ہو، صرف اتنی احتیاط البتہ ملحوظ خاطر رہے کہ اس غیر اللہ کو اللہ کے نام سے متصف نہ کیا جائے۔

ٹھیک اسی طرح سے ختم نبوت کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی اطاعت و انقیاد کے چور دروازے کھلے ہیں۔ یعنی اب بھی انسان مجبور ہے کہ مستقلاً ایک سلسلہء رشد و ہدایت مانے اور اپنی عقیدت و محبت کا اسے مدار اور محور قرار دے۔ ہاں ختم نبوت کے اعتراض سے بچنے کے لئے اس نوع کے سلسلہ کو جو باعتبار واقعہ قطعی نبوت کے مترادف ہے، نبوت کا سلسلہ نہ ٹھہرائے بلکہ اس پر امامت کی چھاپ لگائے۔

امامت و نبوت میں جو فرق حضرات شیعہ کے یہاں ہے، وہ نام اور چھاپ کا تو ضرور ہے، حقیقت و معنی کا ہرگز نہیں۔ اس کے برعکس ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نبوت ایک ایجابی حقیقت کا نام ہے اور ایک مثبت معنی سے تعبیر ہے۔ وہ حقیقت و معنی سوا اطاعت مفروضہ اور بلا شرط و انقیاد کے اور کوئی چیز نہیں۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آپ کے بعد اب کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کی اطاعت ہم پر فرض ہو، جس کا ماننا ضروری ہو اور جو ہمارے لیے اسوہ و نمونہ قرار پاسکے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہمیشہ کے لئے اطاعت و عقیدت کا ایک مرکز ہمارے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔

اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و انقیاد کے اور تمام دروازوں کو امت محمدیہ پر بند کر دیا گیا ہے۔ یعنی نبوت کے جن کواڑوں کو بند کیا گیا ہے، وہ صرف نام اور چھاپ کے کواڑ نہیں، حقیقت و معنی کے کواڑ ہیں۔[7]

مولانا ابوالحسن علی ندوی کہتے ہیں کہ امامت کے عقیدے کا لازمی تقاضا ہے کہ محبت و عقیدت کا جو تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہونا چاہیے، اس کی بجائے توجہ کا پورا مرکز ائمہ کی ذات بن جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

حضرات ائمہ اہل بیت ہمیشہ تاریکی میں مینارہ نور، اور ہدایت و رہنمائی کے امام رہے ہیں، اس میں کسی صحیح العقیدہ مسلمان کو شک نہیں ہو سکتا، لیکن ہمارا احساس یہ ہے کہ شیعہ حضرات کا ان ائمہ اہل بیت سے اتنا غیر معمولی جذباتی تعلق، اور اہل بیت کی محبت میں حد سے بڑھا ہوا انہماک عقل و جذبات اور ضمیر پر غالب آگیا ہے، اور ہمارا تاثر یہ ہے کہ اس شیفتگی و شغف نے اس تعلق و محبت کو کسی حد تک مجروح اور کمزور کر دیا ہے، جو نبوت محمدی اور ذات نبوی کے ساتھ ہر مسلمان کا ہونا چاہیے، جس کی وجہ سے اہل بیت نے عزت و شرف کا مقام حاصل کیا، اور وہ ہماری محبت و تعظیم کے مستحق قرار پائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اندرونی ربط و تعلق کا ایک حصہ (کوٹا) جو اس ذات گرامی کے ساتھ مخصوص تھا، اس تعلق (اہل بیت کے کوٹے) میں داخل ہو گیا۔

چنانچہ ایران کے اخیر دور کے نعتیہ کلام (جس کی کچھ زیادہ مقدار نہیں ہے) وہ جوش و خروش، طبیعت کی روانی اور مضامین کی آمد نہیں ہے جو ان نظموں میں نظر آتی ہے، جو مناقب اہل بیت، مرثیے اور خاص طور پر سیدنا علی مرتضی اور حضرت حسین [رضی اللہ عنہما] کی مدح و توصیف اور مصائب اہل بیت کے بیان میں کہی گئی ہیں۔ یہ فرق شیعہ حضرات کے یہاں ہر جگہ نعت نبوی، اور اہل بیت کی مدح و توصیف کے درمیان دیکھا جا سکتا ہے۔ اردو میں انیس و دبیر کے مرثیے پڑھیے اور اس کا خود ان کے اور دوسرے شعراء کے نعتیہ کلام سے مقابلہ کیجیے جو ان کے ہم مسلک اور ہم مذہب تھے۔ دونوں میں آمد و آورد اور اصلی و ضمنی کا فرق محسوس ہو گا۔ کم و بیش یہی فرق سیرت نبوی اور مناقب اہل بیت میں پایا جاتا ہے۔

یہی چیز ہم نے ایران میں دیکھی کہ وہاں مشاہد و مقابر سے جو تعلق ہے، وہ مساجد سے نہیں معلوم ہوتا۔ نجف و کربلاء اور عتبات عالیہ کے سفر کا جو شوق ہے، وہ حرمین شریفین کی زیارت اور سفر حج کے سلسلہ میں نظر نہیں آتا۔

ہو سکتا ہے، ہمارے اثنا عشری بھائیوں میں یہ رد عمل اہل سنت کے بعض علماء اور پر جوش حضرات کے رویہ اور اہل بیت کے حقوق کے اعتراف میں کوتاہی سے ہوا ہو، لیکن یہ بات رد عمل سے کچھ آگے بڑھی ہوئی ہے۔ محبت و عقیدت، جوش و جذبہ اور تقدیس و تعظیم کا جو ہالہ اس روحانی مرکز کے گرد بن گیا ہے، اور اس کی مدح و توصیف میں جس مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے، اس سے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ چیز امامت کو نبوت کا حریف اور اس کی بہت سی صفات و خصوصیات میں شریک و سہیم نہ بنا دے۔ اگر ایسا ہوا تو پوری زندگی کا دھارا ایک ایسے مرکز کی طرف ہو جائے گا، جو افضل الانبیاء خاتم النبیین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو بہ پہلو پروان چڑھے گا۔ [8]

عقیدہ امامت کے نتائج

عقیدہ امامت میں اہل تشیع اور اہل سنت کے مابین جو اختلاف ہے، اس کے نتائج دونوں کے مابین ایک گہری خلیج تشکیل دے دیتے ہیں۔ چند اہم یہ ہیں:

- اہل تشیع چونکہ ائمہ کو معصوم عن الخطاء مانتے ہیں، اس وجہ سے ائمہ کے ارشادات اور افعال ان کے لئے حدیث کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اہل تشیع کے ہاں دین کے مآخذ میں قرآن و سنت کے علاوہ ایک تیسرے ماخذ ائمہ کے اقوال و افعال کا اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک دین کے مآخذ صرف قرآن اور سنت ہیں۔ مآخذ کا یہ فرق سنی اور شیعہ فقہی احکام میں بہت بڑا فرق پیدا کر دیتا ہے۔
- اہل تشیع کے نزدیک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالی کی جانب سے امامت کے منصب پر فائز کیا گیا تھا اور صحابہ کرام نے ان کے اس منصب کو قبول نہ کیا، اس وجہ سے ان کے نزدیک یہ غصب تھا۔ امامت علی رضی اللہ عنہ کو تسلیم نہ کرنے کے سبب اہل تشیع اکثر صحابہ پر تنقید کرتے ہیں اور بعض تو معاذ اللہ انہیں کافر قرار دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اہل تشیع کا تاریخ اسلام کے بارے میں نظریہ بالکل مختلف ہے۔ اس کی تفصیل کا مطالعہ ہم اگلے سبق میں کریں گے۔

اسائن منٹس

1. امامت سے متعلق اہل تشیع کے قرآنی دلائل کو بیان کیجیے اور یہ بتائیے کہ اہل سنت انہیں کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ دونوں صورتوں میں اپنا جواب لکھئے اور دلیل سے واضح کریں۔
2. خلافت کے بارے میں اہل سنت کا جو تصور ہے، اس کا موازنہ اہل تشیع کے نظریہ امامت سے کیجیے۔ تاریخ میں ان دونوں تصورات

کے بارے میں انٹرنیٹ پر تلاش کیجیے۔

3. امامت کے حق میں تین عقلی دلیلیں جو شیعہ بیان کرتے ہیں لکھیں۔

4. اگر امامت کا نظریہ کسی شیعہ کو سنی یا سنی کو شیعہ سے ڈسکس کرنا ہو تو کس بنیاد پر کرنا مناسب ہو گا؟ امامت سے متعلق اہل تشیع کے دلائل اور اہل سنت کے جوابات کو ایک مکالمے کی صورت میں درج کیجیے۔

تعمیر شخصیت

یہ احساس پیدا کیجیے کہ اللہ ہر وقت مجھے دیکھ رہا ہے اور مجھے اپنے اعمال کے لئے اس کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔

---

[1] تفسیر نمونہ، زیر آیت 2:124

[2] حیات القلوب، ترجمہ اردو، ص 54

[3] تفسیر نمونہ۔ زیر آیت 4:59

[4] حوالہ بالا

[5] تحفۃ الاحوذی، جلد 9، زیر حدیث مذکورہ

[6] دیکھیے شیخ صدوق کی کتاب کمال الدین و تمام النعمۃ اور اس کا اردو ترجمہ فلسفہ غیبت مہدی

[7] مرزائیت نئے زاویوں سے۔ باب: فیصلہ کن تحقیق۔ ص 125-129

[8] دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔ باب ایران۔ ص 102

سبق 4: صحابہ کرام، اہل بیت اور خلافت

جیسا کہ ہم پچھلے سبق میں پڑھ چکے ہیں کہ "عقیدہ امامت" اہل تشیع کے ہاں اصول دین میں سے ہے۔ اس پر بھی ان کے ہاں مکمل اتفاق پایا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا وصی اور خلیفہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو مقرر فرمایا تھا۔ تاریخی حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مسلمانوں کی غالب اکثریت نے ان کی بجائے سیدنا ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو خلیفہ مقرر کیا اور اس کے بعد یہ منصب خلافت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا۔ اپنے آئیڈیل اور حقیقت میں اس فرق کے باعث اسلامی تاریخ اور اس کے اہم کرداروں کے بارے میں اہل تشیع کا نقطہ نظر اہل سنت سے مختلف ہے۔ اس سبق میں ہم اس کی تفصیل کا مطالعہ کریں گے۔

اہل سنت اور اہل تشیع دونوں ہی اس بات پر قائل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان سے محبت ایمان کا تقاضا ہے۔ دونوں اس بات کو بھی مانتے تھے کہ آپ کے جن صحابہ نے پورے خلوص کے ساتھ آپ کا ساتھ دیا وہ نہایت ہی اعلی مرتبہ کے حامل ہیں۔ اختلاف دراصل صحابہ و اہل بیت کے مقام اور مرتبہ میں ہے۔ اسی طرح بعض مخصوص صحابہ کے بارے میں دونوں کا نقطہ نظر مختلف ہے۔ اس کے علاوہ "اہل بیت" کی تعریف میں شیعہ اور سنی نقطہ ہائے نظر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

فریقین کا نقطہ نظر

اہل تشیع کا نقطہ نظر

اہل تشیع کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت میں پانچ افراد شامل تھے: ایک آپ خود، دوسرے آپ کی بیٹی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، تیسرے ان کے شوہر سیدنا علی رضی اللہ عنہ، اور ان کے دو بیٹے سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما۔ برصغیر کی اصطلاح میں انہیں "پنجتن پاک" کہا جاتا ہے۔ اہل تشیع کے نزدیک یہ چاروں حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد افضل الخلائق ہیں۔ آپ کی وفات کے بعد جن صحابہ نے ان چاروں کا ساتھ دیا، ان کے نزدیک وہ سب قابل احترام ہیں۔ ان میں سیدنا مقداد بن اسود، سلمان فارسی، عمار بن یاسر اور ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہم کا شیعہ بہت احترام کرتے ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے والد جناب ابو طالب کو اہل تشیع صحابہ میں شمار کرتے ہیں اور ان کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" لگاتے ہیں جبکہ اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ وہ ایمان لائے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ اہل تشیع کے اس نقطہ نظر کی بنیاد بہت سی احادیث ہیں جو ان کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ شیعہ اہل سنت کی کتابوں سے بھی متعدد احادیث اس ضمن میں پیش کرتے ہیں۔

تاریخ کے بارے میں شیعہ نقطہ نظر کے مطابق چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی امت کی امامت کا منصب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوا تھا، اس وجہ سے آپ کا یہ حق تھا کہ آپ کو خلیفہ مقرر کیا جاتا۔ شیعہ حضرات سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو "وصی الرسول" اور "خلیفۃ بلا فصل" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور یہ الفاظ ان کے ہاں کلمہ اور اذان کا حصہ ہیں۔ شیعہ نقطہ نظر کے مطابق آپ کی بجائے یہ منصب کچھ اور لوگوں کے سپرد کر دینے کے باعث صحابہ کرام علیہم الرضوان کی اکثریت نے ایک جرم کا ارتکاب کیا۔ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلافت ملی تو آپ کے خلاف بہت سے لوگوں نے علم بغاوت بلند کر دیا اور آپ کی شہادت کے بعد اس منصب کو پھر آپ کی اولاد سے چھین لیا۔ اہل تشیع کے نزدیک مسلمانوں کی پوری تاریخ اس ظلم و جبر سے معمور ہے جس سے استثنا صرف چند ادوار کا ہے۔

کٹر شیعہ اس نظریہ کو پوری شدت سے بیان کرتے ہیں اور اس ضمن میں جن افراد کا نام آتا ہے، ان پر کھلے عام "تبرا" کرتے ہیں اور انہیں برا بھلا کہتے ہیں۔ بعض لوگ ان صحابہ پر معاذ اللہ لعنت بھی بھیجتے ہیں۔ اعتدال پسند شیعہ اپنا نقطہ نظر تو بیان کرتے ہیں مگر اس ضمن میں گالی گلوچ سے کام نہیں لیتے کیونکہ یہ شخصیات اہل سنت کے نزدیک نہایت ہی جلیل القدر رہیں۔

اہل سنت کا نقطہ نظر

اہل سنت کے نزدیک اہل بیت کا لفظ قرآن مجید میں بنیادی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لئے آیا ہے۔ ان کے علاوہ اس میں آپ کی بیٹی فاطمہ، ان کے شوہر علی، نواسے حسن و حسین شامل ہیں ہی مگر ان کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری بیٹیاں زینب، رقیہ اور ام کلثوم اور ان کے شوہر ابو العاص اور عثمان بھی شامل ہیں۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اہل سنت سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کی عظمت کے قائل ہیں اور ان کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔

صحابہ کرام کے بارے میں اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ دین میں اہمیت اس بات کی ہے کہ کس نے دن کے لئے کیا خدمات سر انجام دیں۔ ان کے نزدیک صحابہ کرام میں دس صحابہ ایسے تھے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت کی بشارت دی کیونکہ یہ سب وہ تھے جو نہایت نامساعد حالات میں آپ پر ایمان لائے اور انہوں نے آپ کے دین کے لئے تن، من اور دھن کی بازی لگا دی۔ اہل سنت ان سب کا نہایت درجے میں احترام کرتے ہیں اور ہر طرح سے ان کا دفاع کرتے ہیں۔ ان صحابہ کے فضائل پر اہل سنت اپنی کتب سے متعدد احادیث پیش کرتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

1. ابو بکر صدیق (573-634CE/13H): آپ پہلے خلیفہ تھے اور آپ کو دور حکومت 11-13/632-634 تھا۔
2. عمر فاروق (586-645/23H): آپ دوسرے خلیفہ تھے اور آپ نے 13-24/634-644 کے دوران حکومت کی۔
3. عثمان غنی (579-656/35H): تیسرے خلیفہ۔ دور حکومت 23-35/644-656

4. علی المرتضی (598-661/40H): چوتھے خلیفہ۔ دور حکومت 35-40/656-661

5. طلحہ بن عبید اللہ (595-656/36H): سب سے پہلے ایمان لانے والے دس افراد میں شامل ہیں۔

6. زبیر بن عوام (594-656/36H) جو "حواری رسول" کے لقب سے مشہور ہیں۔

7. ابو عبیدہ بن الجراح (580-652/32H) جو "امین الامت" کے لقب سے مشہور ہیں اور شام کو فتح کرنے والی فوج کے سپریم کمانڈر تھے۔

8. سعد بن ابی وقاص (595-664/43H): آپ ایران کو فتح کرنے والی فوج کے سربراہ تھے۔

9. عبد الرحمن بن عوف (580-652/32H)

10. سعید بن زید (593-673/51H): رضی اللہ عنہم (نوٹ: ان تمام صحابہ کے سن پیدائش تقریباً ہیں۔)

اہل سنت کے مطابق یہ تمام صحابہ وہ ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو اس کے ابتدائی سالوں میں قبول کیا اور راہ اسلام میں شدید تکالیف برداشت کیں۔ سنی ان تمام حضرات کا نہایت احترام کرتے ہیں تاہم انہیں گناہ اور خطا سے معصوم نہیں سمجھتے۔ وہ مانتے ہیں کہ ان حضرات سے غلطی کا صدور ممکن ہے تاہم ان کے معاملے میں کسی بھی نوعیت کی گستاخی جائز نہیں ہے۔ سیاسی معاملات میں ان پر شیعہ جو الزامات عائد کرتے ہیں، اہل سنت ان کا پوری شدت سے دفاع کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اہل تشیع ان میں سے کم از کم پانچ حضرات ابو بکر، عمر، عثمان، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم پر کڑی تنقید کرتے ہیں اور ان میں سے بعض ان پر تبرا کرتے ہیں۔ خوارج انہی میں سے حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم پر تنقید کرتے ہیں اور وہ تمام صحابہ جو ان کے زمانے میں موجود تھے، کو کافر قرار دیتے ہیں۔

اہل سنت تمام صحابہ کا یکساں احترام کرتے ہیں تاہم ان کے نزدیک صحابہ کی درجہ بندی، ان کی دینی خدمات کی بنیاد پر ہے، نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاندانی تعلق پر۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں سب سے افضل سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے، ان کے بعد عمر، پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہم، اس کے بعد بقیہ عشرہ مبشرہ، پھر بقیہ سابقون الاولون (سب سے پہلے ایمان لانے والے)، پھر بقیہ اہل بدر، پھر بقیہ اہل احد، پھر وہ صحابہ جو بیعت رضوان میں شریک تھے، پھر وہ صحابہ جو فتح مکہ سے پہلے ایمان لائے اور اس کے بعد وہ صحابہ جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے۔ اس کی ترتیب کی بنیاد یہ ہے جو صحابہ خاص کر غزوہ بدر سے پہلے ایمان لائے، انہوں نے سخت مشکل حالات میں اسلام کے لئے جدوجہد کی۔ بعد میں اسلام ایک عظیم قوت بنتا چلا گیا، تو ایمان لانے والوں کو ان شدید مصائب کا سامنانہ کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اسی ترتیب سے صحابہ کے وظائف مقرر کیے تھے۔

اہل سنت چونکہ نظریہ امامت کے قائل نہیں ہیں، اس وجہ سے ان کے نزدیک تاریخ میں ایسا کوئی ظلم نہیں ہوا کہ جائز امام کو اس کے حق سے محروم رکھا گیا ہو۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ خلیفہ کا انتخاب امت مسلمہ کا کام تھا۔ جب مسلمانوں نے باہم مشورے سے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو منتخب کر لیا تو اس میں ظلم کی کوئی بات نہ تھی۔ یہی معاملہ بعد کے خلفاء کا ہے۔ حضرت ابو بکر نے اپنی وفات سے پہلے تمام صحابہ جن میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، کے مشورے سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت کے وقت خلیفہ کے انتخاب کے لئے ایک کمیٹی بنادی جس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی سے عام لوگوں سے رائے لینے کے بعد متفقہ طور پر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کر لیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان تینوں خلفاء کی بیعت فرمائی، ان کے ساتھ خلافت کی ذمہ داریوں میں شریک رہے اور جب آپ نے خود ان ذمہ داریوں کو قبول فرمایا تو پھر کوئی ظلم نہیں رہ جاتا ہے۔

ہاں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت خارجی فرقہ کا بہت بڑا ظلم تھا جس کی اہل سنت مذمت کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ کے بیٹے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو بھی اہل سنت ظلم اور بہت بڑا سانحہ مانتے ہیں اور (ایک مختصر گروہ کے علاوہ) باقی تمام اہل سنت وقت کے سلطان یزید پر شدید تنقید کرتے ہیں۔

اہل تشیع کے دلائل اور اہل سنت کا جواب

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے وصی الرسول اور خلیفۃ بلافصل ہونے پر شیعہ حضرات اپنی کتب سے متعدد احادیث پیش کرتے ہیں۔ چونکہ یہ احادیث اہل سنت کے ہاں مستند اور لائق اعتماد نہیں ہیں، اس وجہ سے ان کے ذریعے اہل سنت پر حجت تمام نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ حضرات اس ضمن میں اہل سنت کی کتابوں سے کچھ احادیث پیش کرتے ہیں۔ یہاں ہم ان احادیث کو درج کریں گے اور اس کے بعد یہ بیان کریں گے کہ اہل سنت ان احادیث کو کیسے سمجھتے ہیں۔ یہ احادیث ہم سید فخر الدین موسوی صاحب کی کتاب "علی خلیفۃ الرسول" سے پیش کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ چند آیات بھی اس ضمن میں پیش کرتے ہیں جو کہ یہ ہیں:

آیت تبلیغ اور آیت تطہیر

تفصیلات کے لیے پچھلا سبق ملاحظہ کیجیے۔

ہارون علیہ الصلوۃ السلام سے نسبت

حدثنا مسدد: حدثنا يحيى، عن شعبة، عن الحكم، عن مصعب ابن سعد، عن أبيه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم خرج إلى تبوك، واستخلف عليا، فقال: أتخلفني في الصبيان والنساء؟ قال: ألا ترضى أن تكون مني بمنزلة هارون من موسى؟ إلا أنه ليس نبي بعدي.

سعد کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک کے لئے نکلے تو اپنے پیچھے علی رضی اللہ عنہ کو (بطور حاکم مدینہ) چھوڑ گئے۔ انہوں نے عرض کیا: "کیا آپ مجھے بچوں اور خواتین کے پاس چھوڑے جا رہے ہیں؟" فرمایا: "کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تمہاری مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کی موسی سے تھی؟ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔" (بخاری، کتاب المغازی، حدیث 4154)

اہل سنت اس حدیث کو مستند مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوہ تبوک کے لئے جاتے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا تھا۔ کئی اور مواقع پر یہ خدمت مزید صحابہ جیسے حضرت ابو بکر یا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما کے سپرد کی گئی۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ آپ وصی الرسول اور خلیفۃ بلا فصل ہو گئے ورنہ ان تمام صحابہ کو وصی ماننا پڑے گا جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے پیچھے مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا ہو۔ سیدنا ہارون علیہ السلام سے آپ کی نسبت اس اعتبار سے کی گئی کہ جیسا موسی و ہارون علیہما الصلوۃ والسلام بھائی ہیں، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی ہیں۔

خطبہ غدیر خم

اہل تشیع کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر خم کے مقام پر ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ یہ اہل سنت کی کتب میں بھی روایت ہوا ہے:

اسمعيل بن نشيط العامري سمع شهر بن حوشب وجميلا سمع منه أبو نعيم ويونس بن بكير، قال لي عبيد حدثنا يونس سمع اسمعيل عن جميل بن عامر أن سالما حدثه سمع من سمع النبي صلى الله عليه وسلم يقول يوم غدير خم من كنت مولاه فعلي مولاه.

سالم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے غدیر خم کے دین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جس کا میں مولا ہوں، اس کا علی بھی مولا ہے۔ ابو عبد اللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی اسناد میں کچھ مسائل ہیں۔ (بخاری، تاریخ الکبیر، حدیث 2458, 1191، ترمذی)

اس روایت کے بارے میں اہل سنت کہتے ہیں کہ اول تو اس کی اکثر اسناد ضعیف ہیں۔ روایت کے الفاظ میں بھی کہیں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جانشین مقرر کرنے کا حکم نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی مقامی نوعیت کا جھگڑا ہوا ہو، جس میں آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درجے کے بارے میں وضاحت فرما دی ہو۔ اگر یہاں خلافت اور جانشینی جیسا عظیم الشان اعلان مقصود ہوتا تو پھر اس کے لئے حجۃ الوداع کا موقع ہی بہترین تھا جب پورے عرب کے لوگ اکٹھا تھے نہ کہ جب لوگ واپس جا رہے تھے تو ایک پڑاؤ کے مقام پر یہ ارشاد فرمایا جاتا۔ یہ بھی واضح ہے کہ غدیر خم مکہ سے مدینہ کے راستہ میں تھا اور اس موقع پر مسلمانوں کا ایک ہی گروہ آپ کے پاس تھا جو مکہ سے شمال کی جانب جا رہے تھے۔ مشرق اور جنوب کی جانب سے آنے والے حاجی اپنے اپنے راستوں پر واپس جا چکے تھے۔ شمال کی طرف جانے والے حاجی بھی سب کے سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں تھے بلکہ راستے بھر میں بکھرے ہوئے تھے۔ اگر حجۃ الوداع کے موقع پر جانشینی کا اعلان کر دیا جاتا تو خلافت کا جھگڑا ہی کبھی پیدا نہ ہوتا۔

حدیث قرطاس

وحدثني محمد بن رافع وعبد بن حميد (قال عبد: أخبرنا. وقال ابن رافع: حدثنا عبدالرزاق). أخبرنا معمر عن الزهري، عن عبيدالله بن عبدالله بن عتبة، عن ابن عباس، قال:

لما حضر رسول الله صلى الله عليه وسلم وفي البيت رجال فيهم عمر ابن الخطاب. فقال النبي صلى الله عليه وسلم (هلم أكتب لكم كتابا لا تضلون بعده). فقال عمر: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قد غلب عليه الوجع. وعندكم القرآن. حسبنا كتاب الله. فاختلف أهل البيت. فاختصموا. فمنهم من يقول: قربوا يكتب لكم رسول الله صلى الله عليه وسلم كتابا لن تضلوا بعده، ومنهم من يقول ما قال عمر. فلما أكثروا اللغو والاختلاف عند رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قوموا.قال عبيدالله: فكان ابن عباس يقول: إن الرزية كل الرزية ما حال بين رسول الله صلى الله عليه وسلم وبين أن يكتب لهم ذلك الكتاب، من اختلافهم ولغطهم.

ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں حاضر ہوئے تو وہاں کچھ لوگ تھے جن میں عمر بن خطاب بھی تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں تمہیں کچھ لکھ کر نہ دے دوں جس سے تم میرے بعد گمراہ نہ ہو۔" عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درد کا غلبہ ہے، (آپ کو تکلیف نہ دو) تمہارے پاس قرآن ہے۔ ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔" گھر والوں میں اختلاف ہو گیا اور وہ بحث کرنے لگے۔ ان میں سے کسی نے کہا، قریب آ کر وہ لکھ لو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھوانا چاہتے ہیں تاکہ تم آپ کے بعد گمراہ نہ ہو جاؤ۔ ان میں سے بعض وہ بات کہہ رہے تھے جو عمر نے کہا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لغو اور اختلاف زیادہ ہو گیا تو آپ نے فرمایا۔ "اٹھو۔"

ابن عباس کہا کرتے تھے: یہ بہت بڑا نقصان تھا جو اس اختلاف کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی وصیت لکھوانے کے مابین ہو گیا تھا۔ (بخاری کتاب الاعتصام، ومسلم کتاب الوصیۃ)

اس حدیث کے بارے میں اہل تشیع کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں وصیت لکھوانا چاہتے تھے جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بعض لوگوں نے لکھوانے نہ دیا۔ اہل سنت اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہاں مطلقاً وصیت کا ذکر ہے۔ یہ بیان نہیں ہے کہ آپ کیا لکھوانا چاہتے تھے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعد خلیفہ کا تعین کرنا چاہتے تھے تو پھر آپ محض لوگوں کی باتوں میں آ کر رکنے والے نہیں تھے۔ خاص کر شیعہ نقطہ نظر کے مطابق، اگر اللہ تعالی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو پھر تو ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی وصیت نہ کرتے۔ اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی اللہ تعالی کے مقرر کردہ حق کو کیسے چھوڑنے والے تھے؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وصیت کچھ نصیحتوں وغیرہ کے بارے میں تھی اور آپ نے اسے لکھوانا کچھ ضروری خیال نہ کیا۔ مسند احمد کی ایک روایت کے مطابق سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے آپ سے اس بارے میں بعد میں پوچھا تھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نماز، زکوۃ اور غلاموں سے اچھا سلوک کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔

اہل سنت ہی کے ایک چھوٹے سے گروہ کے نزدیک یہ حدیث لائق اعتماد نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں ابن شہاب زہری (d. 124/741) ہیں۔[1] یہ صاحب اہل سنت اور اہل تشیع دونوں ہی کے نزدیک حدیث میں بہت بلند مقام کے حامل ہیں۔ اس گروہ کا خیال یہ ہے کہ اہل تشیع نے زہری کو اہل سنت میں اپنی وضع کردہ احادیث پھیلانے کے لئے دانستہ یا نادانستہ طور پر استعمال کیا ہے۔ اس نقطہ نظر کی اہل سنت ہی میں سے بہت سے لوگوں، خاص کر اہل حدیث حضرات نے سختی تردید کی ہے۔

علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق

حدثنا إسماعيل بن موسى حدثنا شريك عن أبي إسحاق عن حبشي بن جنادة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم علي مني وأنا من علي ولا يؤدي عني إلا أنا أو علي قال أبو عيسى هذا حديث حسن غريب.

جنادہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں۔ میرا قرض میری جانب سے یا میں ادا کروں یا علی۔ ابوعیسی ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن غریب (درمیانے درجے کی) ہے۔ (ترمذی، حدیث 3719)

حدثنا يوسف بن موسى القطان البغدادي حدثنا علي بن قادم حدثنا علي بن صالح بن حيي عن حكيم بن جبير عن جميع بن عمير التيمي عن بن عمر قال آخى رسول الله صلى الله عليه وسلم بين أصحابه فجاء علي تدمع عيناه فقال يا رسول الله آخيت بين أصحابك ولم تؤاخ بيني وبين أحد فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم أنت أخي في الدنيا والآخرة قال أبو عيسى هذا حديث حسن غريب

ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کے مابین بھائی چارہ کروایا تو علی آئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے اپنے صحابہ کے درمیان تو بھائی چارہ کروایا مگر مجھے کسی کا بھائی نہیں بنایا۔ آپ نے فرمایا: "تم دنیا اور آخرت میں میرے بھائی ہو۔" امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے (یعنی درمیانے درجے کی ہے اور اس کی روایت تنہا ایک شخص نے کی ہے۔) (ترمذی، حدیث 3720)

حدثنا علي بن المنذر كوفي حدثنا محمد بن فضيل قال حدثنا الأعمش عن عطية عن أبي سعيد والأعمش عن حبيب بن أبي ثابت عن زيد بن أرقم رضي الله تعالى عنهما قالا قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إني تارك فيكم ما إن تمسكتم به لن تضلوا بعدي أحدهما أعظم من الآخر كتاب الله حبل ممدود من السماء إلى الأرض وعترتي أهل بيتي ولن يتفرقا حتى يردا علي الحوض فانظروا كيف تخلفوني فيهما قال هذا حديث حسن غريب

زید بن ارقم رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم انہیں مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو میرے بعد گمراہ نہ ہو گے۔ ان میں سے پہلی اور سب سے بڑی کتاب اللہ ہے جو کہ وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین کے درمیان لٹکی ہوئی ہے۔ دوسرے میرے اہل بیت ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے جب تک کہ حوض پر مجھے آ نہ ملیں گے۔ تو دیکھو کہ تم میرے بعد ان سے کیا کرتے ہو۔" ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن غریب (درمیانے درجے کی) ہے۔ (ترمذی، حدیث 3788)

اہل سنت کا کہنا ہے کہ ان احادیث میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ کا تعلق بیان ہوا ہے

جس کے وہ بھی قائل ہیں۔ ان احادیث سے کہیں بھی خلافت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ متعدد احادیث میں دیگر خلفاء راشدین کے فضائل اور ان کا حضور سے تعلق بیان ہوا ہے۔ اہل سنت تمام صحابہ اور اہل بیت کا احترام کرتے ہیں اور ان کی فضیلت کے قائل ہیں۔ چونکہ انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا، اس لیے کسی پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک اہل بیت کا تعلق ہے تو ان کی عظمت کے اہل سنت بھی قائل ہیں۔ اہل بیت میں نہ صرف سیدنا علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر بیٹیاں اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بھی داخل ہیں۔ ان سب کے ساتھ تعلق رکھنا اور ان کی دی ہوئی ہدایت پر عمل کرنے کو اہل سنت بھی ضروری مانتے ہیں البتہ ان کے نزدیک اس حدیث سے بھی خلافت ثابت نہیں ہوتی ہے۔

علی رضی اللہ عنہ کو ایذا دینا

وعن عمرو بن شاس الأسلمي – وكان من أصحاب الحديبية – قال: خرجت مع علي عليه السلام إلى اليمن فجفاني في سفري ذلك حتى وجدت في نفسي عليه فلما قدمت المدينة أظهرت شكايته في المسجد حتى سمع بذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم فدخلت المسجد ذات غداة ورسول الله صلى الله عليه وسلم جالس في ناس من أصحابه فلما رآني أبد لي عينيه يقول حدد إلي النظر حتى إذا جلست قال يا عمرو والله لقد آذيتني قلت أعوذ بالله من أذاك يا رسول الله قال بلى من آذى عليا فقد آذاني. رواه أحمد والطبراني باختصار والبزار أخصر منه ورجال أحمد ثقات.

عمرو بن شاس اسلمی، جو کہ اصحاب حدیبیہ میں سے تھے، کہتے ہیں: میں علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یمن کی طرف سفر کے لئے نکلا۔ انہوں نے سفر کے دوران مجھ پر کچھ زیادتی کر دی جس سے میرے دل میں ان کے بارے میں خفگی پیدا ہو گئی۔ جب میں مدینہ واپس آیا تو میں نے مسجد میں یہ شکایت بیان کی۔ اگلی صبح جب میں مسجد میں داخل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ہمراہ تشریف فرما تھے۔ جب میں بیٹھا تو فرمایا: "عمرو! تم نے مجھے اذیت دی۔" میں نے عرض کیا: "میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ آپ کو اذیت دوں۔ یا رسول اللہ!" فرمایا: "ہاں، جس نے علی کو اذیت دی، اس نے مجھے اذیت دی۔" احمد اور طبرانی نے اسے اختصار کے ساتھ روایت کیا، بزار نے مزید مختصر کیا۔ احمد کے بیان کردہ راوی قابل اعتماد ہیں۔ (مجمع الزوائد، حدیث 14736)

اہل سنت کہتے ہیں کہ اس واقعے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے دل میں خفگی دور فرمائی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ایذا دینا ان کے نزدیک بھی بری بات ہے البتہ محض تاریخی روایات کی بنیاد پر کسی صحابی کے بارے میں یہ گمان کر لینا کہ انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ایذا دی ہو گی، درست نہیں ہے۔ اس حدیث سے بھی بہر حال خلافت کا ثبوت نہیں ہے۔

علی رضی اللہ عنہ سے متعلق دیگر احادیث

ان کے علاوہ اہل تشیع اہل سنت کی کتب میں سے جو احادیث پیش کرتے ہیں، وہ اہل سنت کے نزدیک ضعیف ہیں کیونکہ ان کے راویوں میں ایسے لوگ شامل ہیں جو کہ غالی شیعوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان احادیث کی بنیاد پر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ان احادیث کو

اہل سنت کے محدثین جیسے ابن عدی، ابن جوزی وغیرہم نے ضعیف یا موضوع (جعلی) قرار دیا تھا۔ دور تدوین میں سنی محدثین نے انہیں اپنی کتب میں اس وجہ سے درج کر لیا کہ وہ صحیح وضعیف ہر قسم کی روایات کو اکٹھا کرنا چاہتے تھے۔

اہل سنت کے دلائل اور اہل تشیع کا جواب

اہل سنت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اپنے موقف کے حق میں قرآن مجید، شیعہ کتب حدیث اور عقل عام سے دلائل پیش کرتے ہیں:

قرآن سے دلائل

اہل سنت فضیلت صحابہ میں یہ آیات پیش کرتے ہیں:

وَالسَّابِقُونَ الأَوَّلُونَ مِنْ الْمُهَاجِرِينَ وَالأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَداً ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ.

مہاجرین و انصار میں سبقت لے جانے والے اور وہ جنہوں نے نیکی میں ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے۔ اس نے ان کے لئے جنتیں تیار کر رکھی ہیں جن کے نیچے دریا جاری ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہ بڑی کامیابی ہے۔ (التوبہ 9:100)

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِنْ اللَّهِ وَرِضْوَاناً سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ.

محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی کفار پر سخت اور آپس میں نرم دل ہیں۔ تم انہیں رکوع و سجود کرتے دیکھو گے۔ وہ اللہ کے فضل اور رضا کے طالب ہیں۔ سجدوں کے اثرات ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ (الفتح 48:29)

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُوْلَئِكَ هُمْ الْمُفْلِحُونَ.

تو جو لوگ ان [نبی] پر ایمان لائے اور انہوں نے آپ کی حمایت اور مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو آپ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (الاعراف 7:157)

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَنَصَرُوا أُوْلَئِكَ هُمْ الْمُؤْمِنُونَ حَقّاً لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ.

جو لوگ ایمان لائے، انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور ان کی مدد کی، وہی سچے مومن ہیں، ان کے لئے مغفرت اور عزت والا رزق ہے۔ (الانفال 8:74)

شیعہ حضرات کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ آیات عمومی ہیں اور ان میں کسی خاص صحابی کا نام نہیں ہے۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ درج ذیل آیت

میں صاف الفاظ میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مثبت انداز میں تذکرہ ہے جو سفر ہجرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔

إِلاَّ تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَى وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ.

اگر تم ان [رسول] کی مدد نہ کروگے تو اللہ ان کی مدد کر چکا ہے۔ جب اس نے انہیں کفار کے بیچ میں سے نکالا اور وہ دو میں سے دوسرے تھے اور غار میں تھے۔ جب وہ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے: "غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" تو اللہ نے ان پر سکون نازل فرما دیا اور ان کی ایسے لشکروں سے مدد فرمائی جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور اس نے اہل کفر کی بات کو نیچا اور اللہ کی بات کو اونچا کر دکھایا۔ اور اللہ زبردست طاقت اور حکمت والا ہے۔ (التوبہ 9:40)

اہل تشیع کہتے ہیں کہ صحابہ ہی میں بعض ایسے تھے جو منافق تھے۔ یہ آیات صرف مخلص صحابہ ہی کے بارے میں ہو سکتی ہیں۔ وہ جن صحابہ پر تنقید کرتے ہیں، وہ ان کے خیال میں منافقین میں شمار ہوتے ہیں۔

اہل سنت اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ منافقین کا طبقہ اسی وقت ہی وجود میں آیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت کے بعد مدینہ میں حکومت مل گئی تھی اور اسلام ایک بڑی طاقت بن گیا تھا۔ آپ کی مکی زندگی میں منافقین کا وجود نہ تھا کیونکہ کون ایسا بے وقوف ہو گا جو ایسے دین کے لئے تشدد سہتا پھرے جس کو وہ دل سے تسلیم نہیں کرتا۔ حضرت ابو بکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، ابوعبیدہ، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم تو سب کے سب وہ سابقون الاولون ہیں جو مکی زندگی میں اس وقت ایمان لائے جب مسلمان نہایت ہی کمزور اور زیردست تھے۔ انہوں نے دین کی خاطر تکالیف اس زمانے میں برداشت کیں جب نفاق کا وجود ممکن ہی نہ تھا۔ اگر معاذ اللہ ان میں بھی منافقین موجود تھے تو پھر انہوں نے ایسے دین کی خاطر تشدد برداشت کیوں کیا جس پر وہ ایمان نہ رکھتے تھے۔

اہل سنت خلفاء راشدین کی خلافت کے ثبوت میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمْ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِي لا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئاً وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمْ الْفَاسِقُونَ.

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور ضرور زمین میں خلافت عطا کرے گا جیسا کہ اس نے انہیں خلافت عطا کی جو ان سے پہلے تھے۔ وہ ان کے دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کر لیا ہے اور خوف کو امن سے بدل دے گا۔ انہیں چاہیے کہ وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ جس نے اس کے بعد کفر کیا

تو وہی لوگ فاسق ہیں۔ (النور 24:55)

اہل سنت کہتے ہیں کہ سورۃ النور کی آیت میں واضح طور پر صحابہ کرام کو خلافت عطا کرنے کا وعدہ ہے۔ اہل تشیع میں سے بعض اس بات کو درست تسلیم کرتے ہیں، جبکہ ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ اس آیت کا مصداق امام مہدی کی خلافت ہے جو آخری زمانے میں قائم ہو گی۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ آیت کا سیاق وسباق اس بات کی دلیل ہے کہ مراد صحابہ کرام کی خلافت ہے کیونکہ ان آیات میں مسلسل صحابہ کرام ہی کے زمانے کے اہل ایمان کا ذکر ہے اور ان منافقین کی تردید ہے جو ان کے وقت میں موجود تھے۔ پورا سیاق یہ ہے:

وَمَنْ يُطِعْ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقِيهِ فَأُوْلَئِكَ هُمْ الْفَائِزُونَ (52) وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ أَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ قُلْ لا تُقْسِمُوا طَاعَةٌ مَعْرُوفَةٌ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (53) قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلاَّ الْبَلاغُ الْمُبِينُ (54) وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمْ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِي لا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئاً وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمْ الْفَاسِقُونَ (55) وَأَقِيمُوا الصَّلاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (56) لا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مُعْجِزِينَ فِي الأَرْضِ وَمَأْوَاهُمْ النَّارُ وَلَبِئْسَ الْمَصِيرُ (57)

جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس کے معاملے میں تقوی اختیار کرے، تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔ [یہ منافق] اللہ کے نام کی بڑی بڑی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر آپ انہیں حکم دیں تو یہ [راہ خدا میں جہاد کے لیے] نکل کھڑے ہوں گے۔ آپ فرمائیے، کہ قسم مت کھاؤ، تمہاری اطاعت کا حال معلوم ہے۔ جو تم کرتے ہو، یقیناً اللہ اس سے باخبر ہے۔ آپ فرمائیے! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور پھر اگر وہ منہ موڑیں جو انہوں نے کیا، اس کا وبال ان پر ہے اور جو تم نے کیا، اس کی ذمہ داری تم پر ہے۔ اگر وہ اطاعت کریں تو ہدایت یافتہ ہو جائیں۔ رسول کے ذمے سوائے واضح طور پر پہنچا دینے کے اور کچھ نہیں ہے۔

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور ضرور زمین میں خلافت عطا کرے گا جیسا کہ اس نے انہیں خلافت عطا کی جو ان سے پہلے تھے۔ وہ ان کے دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کر لیا ہے اور خوف کو امن سے بدل دے گا۔ انہیں چاہیے کہ وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ جس نے اس کے بعد کفر کیا تو وہی لوگ فاسق ہیں۔ نماز قائم کرو، زکوۃ ادا کرو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ جو لوگ کفر کر رہے ہیں، ان کے بارے میں غلط فہمی میں مت رہنا کہ وہ زمین میں اللہ کو عاجز کر دیں گے۔ ان کا ٹھکانہ آگ ہے اور کیا ہی وہ برا ٹھکانہ ہے۔ (النور)

اس آیت کی تفسیر میں سنی عالم، سید ابو الاعلی مودودی (1979-1903) لکھتے ہیں:

اس جگہ ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ یہ وعدہ بعد کے مسلمانوں کو تو [اگر پہنچتا ہے تو] بالواسطہ پہنچتا ہے۔ بلاواسطہ اس کے مخاطب وہ لوگ تھے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود تھے۔ وعدہ جب کیا گیا تھا، اس وقت واقعی مسلمانوں پر حالت خوف طاری تھی اور دین اسلام نے ابھی حجاز کی زمین میں بھی مضبوط جڑ نہیں پکڑی تھی۔ اس کے چند سال بعد یہ حالت خوف، نہ صرف امن سے بدل گئی بلکہ اسلام عرب سے نکل

کر ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصے پر چھا گیا اور اس کی جڑیں اپنی پیدائش کی زمین ہی می نہیں، کرہ ارض میں جم گئیں۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ ابو بکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پورا کر دیا۔ اس کے بعد کوئی انصاف پسند آدمی مشکل ہی سے اس امر میں شک کر سکتا ہے کہ ان تینوں حضرات کی خلافت پر خود قرآن کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے اور ان کے مومن صالح ہونے کی شہادت اللہ تعالیٰ خود دے رہا ہے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو نہج البلاغہ میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی وہ تقریر پڑھ لے جو انہوں نے حضرت عمر کو ایرانیوں کے مقابلے پر خود جانے کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کی تھی۔ [یہ خطبہ آگے آ رہا ہے۔][2]

اہل سنت اس کے علاوہ سورۃ الفتح کی یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلامَ اللَّهِ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا بَلْ كَانُوا لا يَفْقَهُونَ إِلاَّ قَلِيلاً. قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنْ الأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَى قَوْمٍ أُوْلِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمْ اللَّهُ أَجْراً حَسَناً وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَاباً أَلِيماً.

جب تم مال غنیمت لینے کے لیے جانے لگو گے تو پیچھے رہ جانے والے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ ان کا ارادہ ہے کہ یہ اللہ کے کلام کو بدل دیں۔ آپ صاف کہہ دیجیے: تم ہر گز ہمارے ساتھ نہ چل سکو گے۔ اسی طرح اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے۔ یہ کہیں گے کہ نہیں تم ہم سے حسد کر رہے ہو۔ بلکہ یہ بہت کم ہی سمجھتے ہیں۔

آپ پیچھے رہ جانے والے ان دیہاتیوں سے کہہ دیجیے کہ تمہیں عنقریب ایسی قوم کے ساتھ لڑنے کے لئے بلایا جائے گا جو سخت قوت والی ہے۔ تم کو ان سے جنگ کرنا ہو گی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا اور اگر منہ موڑو گے جیسا کہ تم نے اس سے پہلے منہ موڑا تو وہ تمہیں دردناک عذاب دے گا۔ (الفتح 48:15-16)

اہل سنت کہتے ہیں کہ سورۃ الفتح کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ 6/627 میں صلح حدیبیہ کے فوراً بعد نازل ہوئی۔ اس کے بعد مسلمانوں کو ایک ہی سخت جنگ کا سامنا کرنا پڑا جو کہ غزوہ خیبر تھی۔ اس میں ان دیہاتیوں کو شریک نہیں کیا گیا جن کا ذکر ان آیات میں ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو مسلمانوں کو کسی سخت قوت سے ٹکرانا نہیں پڑا۔ 8/629 میں مکہ بغیر کسی جنگ کے فتح ہوا۔ اس کے بعد ہوازن کے ایک چھوٹے سے لشکر سے حنین کے مقام پر معمولی سی جنگ ہوئی جس میں ان کے 6000 لوگ گرفتار ہوئے۔ تبوک کے موقع پر بھی کوئی جنگ نہ ہوئی۔ اس کے بعد کوئی بڑی جنگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دوران نہ ہوئی البتہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران میں 11/632 میں ان مرتدین سے جنگ درپیش ہوئی جنہوں نے آپ کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت حق تھی اور اس کا ذکر قرآن میں ہے۔

شیعہ مفسر آیت اللہ مکارم شیرازی صاحب نے اس آیت سے مراد فتح مکہ اور غزوہ حنین لی ہے۔ اہل سنت کا کہنا ہے کہ یہ درست نہیں ہے کیونکہ ان دونوں جنگوں میں مسلمانوں کو کسی طاقتور دشمن کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور بڑے اطمینان سے فتح حاصل ہو گئی۔ غزوہ حنین

میں شروع میں تھوڑی سی مشکل ہوئی مگر اس کے بعد 6000 قیدی اور بے بہا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس وجہ سے اس آیت کا اولین مصداق عہد صدیقی کی جنگیں ہو سکتی ہیں۔ بعض شیعہ مفسرین جیسے حسین بخش جاڑا صاحب نے اس سے مراد جنگ صفین لی ہے جو آیت کے نزول کے کہیں بعد 37/657 میں ہوئی اور اس میں شریک دونوں فریق مسلمان تھے۔

شیعہ کتب حدیث سے دلائل

فضیلت صحابہ میں اہل سنت کی کتب حدیث میں تو بہت سی احادیث ہیں مگر ان کا ذکر کرنے کا فائدہ نہیں ہے کیونکہ شیعہ حضرات ان کتب کو نہیں مانتے۔ یہاں ہم وہی احادیث و آثار پیش کر رہے ہیں جو اہل تشیع کی کتب میں آئی ہیں:

ومن كلام له (عليه السلام) وقد شاوره عمر بن الخطاب في الخروج إلى غزو الروم:

وَ قَدْ تَوَكَّلَ اللَّهُ لأَهْلِ هَذَا الدِّينِ بِإِعْزَازِ الْحَوْزَةِ وسَتْرِ الْعَوْرَةِ وَ الَّذِي نَصَرَهُمْ وهُمْ قَلِيلٌ لا يَنْتَصِرُونَ ومَنَعَهُمْ وهُمْ قَلِيلٌ لا يَمْتَنِعُونَ حَيٌّ لا يَمُوتُ إِنَّكَ مَتَى تَسِرْ إِلَى هَذَا الْعَدُوِّ بِنَفْسِكَ فَتَلْقَهُمْ فَتُنْكَبْ لا تَكُنْ لِلْمُسْلِمِينَ كَانِفَةٌ دُونَ أَقْصَى بِلادِهِمْ لَيْسَ بَعْدَكَ مَرْجِعٌ يَرْجِعُونَ إِلَيْهِ فَابْعَثْ إِلَيْهِمْ رَجُلاً مِحْرَباً واحْفِزْ مَعَهُ أَهْلَ الْبَلاءِ والنَّصِيحَةِ فَإِنْ أَظْهَرَ اللَّهُ فَذَاكَ مَا تُحِبُّ وإِنْ تَكُنِ الأُخْرَى كُنْتَ رِدْءاً لِلنَّاسِ ومَثَابَةً لِلْمُسْلِمِينَ.

حضرت علی علیہ السلام کا کلام جب عمر بن خطاب نے روم کے خلاف غزوہ کے لیے ان سے مشورہ مانگا: "اللہ نے اس دین کے ماننے والوں کے کنٹرول کو مضبوط کر کے اور پوشیدہ معاملات کو چھپا کر ان پر اعتماد کیا۔ وہی ہے جس نے ان کی اس وقت مدد کی جب وہ قلیل تھے اور اپنی مدد نہ کر سکتے تھے۔ اس نے [کفار کے حملوں] کو روکا جب کہ وہ قلیل تھے اور انہیں نہ روک سکتے تھے۔ وہ زندہ ہے اور اسے موت نہ آئے گی۔ اگر آپ نے خود اس دشمن کی طرف سفر کر کے مقابلہ کیا اور اس میں نقصان ہو گیا تو مسلمانوں پر کوئی چھاؤں نہ رہ جائے گی۔ آپ کے بعد دور دراز شہروں میں کوئی ایسا مرجع نہ ہو گا جس کی جانب وہ رجوع کریں۔ آپ کسی تجربہ کار جنگجو کو ان کی جانب بھیجیے اور اس کے ساتھ بہادر اور خیر خواہ لوگوں کو بھیجیے۔ اگر اللہ نے انہیں غالب کر دیا تو یہ وہی بات ہے جو آپ پسند کرتے ہیں۔ اور اگر دوسرا معاملہ [یعنی شکست] ہو گئی تو آپ لوگوں کے لیے پلٹنے کی جگہ اور مسلمانوں کے لیے لوٹنے کی جگہ پر ہوں گے۔ (نہج البلاغۃ، خطبہ 146)

ومن كلام له (عليه السلام) وقد استشاره عمر بن الخطاب في الشخوص لقتال الفرس بنفسه:

إِنَّ هَذَا الأَمْرَ لَمْ يَكُنْ نَصْرُهُ ولا خِذْلانُهُ بِكَثْرَةٍ ولا بِقِلَّةٍ وهُوَ دِينُ اللَّهِ الَّذِي أَظْهَرَهُ وجُنْدُهُ الَّذِي أَعَدَّهُ وأَمَدَّهُ حَتَّى بَلَغَ مَا بَلَغَ وطَلَعَ حَيْثُ طَلَعَ ونَحْنُ عَلَى مَوْعُودٍ مِنَ اللَّهِ واللَّهُ مُنْجِزٌ وَعْدَهُ ونَاصِرٌ جُنْدَهُ ومَكَانُ الْقَيِّمِ بِالأَمْرِ مَكَانُ النِّظَامِ مِنَ الْخَرَزِ يَجْمَعُهُ ويَضُمُّهُ فَإِنِ انْقَطَعَ النِّظَامُ تَفَرَّقَ الْخَرَزُ وذَهَبَ ثُمَّ لَمْ يَجْتَمِعْ بِحَذَافِيرِهِ أَبَداً والْعَرَبُ الْيَوْمَ وإِنْ كَانُوا قَلِيلاً فَهُمْ كَثِيرُونَ بِالإِسْلامِ عَزِيزُونَ بِالاجْتِمَاعِ فَكُنْ قُطْباً واسْتَدِرِ الرَّحَى بِالْعَرَبِ وأَصْلِهِمْ دُونَكَ نَارَ الْحَرْبِ فَإِنَّكَ إِنْ شَخَصْتَ مِنْ هَذِهِ الأَرْضِ انْتَقَضَتْ عَلَيْكَ الْعَرَبُ مِنْ أَطْرَافِهَا وأَقْطَارِهَا حَتَّى يَكُونَ مَا تَدَعُ وَرَاءَكَ مِنَ الْعَوْرَاتِ أَهَمَّ إِلَيْكَ مِمَّا بَيْنَ يَدَيْكَ إِنَّ الأَعَاجِمَ إِنْ يَنْظُرُوا إِلَيْكَ غَداً يَقُولُوا هَذَا أَصْلُ الْعَرَبِ فَإِذَا اقْتَطَعْتُمُوهُ اسْتَرَحْتُمْ فَيَكُونُ ذَلِكَ أَشَدَّ لِكَلَبِهِمْ عَلَيْكَ وطَمَعِهِمْ فِيكَ فَأَمَّا مَا ذَكَرْتَ مِنْ مَسِيرِ الْقَوْمِ إِلَى قِتَالِ الْمُسْلِمِينَ فَإِنَّ اللَّهَ سُبْحَانَهُ هُوَ أَكْرَهُ لِمَسِيرِهِمْ مِنْكَ وهُوَ أَقْدَرُ عَلَى تَغْيِيرِ مَا يَكْرَهُ وَ أَمَّا مَا ذَكَرْتَ مِنْ عَدَدِهِمْ فَإِنَّا لَمْ نَكُنْ نُقَاتِلُ فِيمَا مَضَى بِالْكَثْرَةِ وإِنَّمَا كُنَّا نُقَاتِلُ بِالنَّصْرِ والْمَعُونَةِ

جب عمر بن خطاب نے فارس کی جنگ میں جانے کے بارے میں مشورہ طلب کیا۔

یاد رکھیے کہ اسلام کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار قلت و کثرت پر نہیں ہے بلکہ یہ دین، دین خدا ہے جسے اسی نے غالب بنایا ہے اور یہ اسی کا لشکر ہے جسے اسی نے تیار کیا ہے اور اسی نے اس کی امداد کی ہے۔ یہاں تک کہ اس منزل تک پہنچ گیا ہے اور اس قدر پھیلاؤ حاصل کر لیا ہے۔ ہم پروردگار کی طرف سے ایک وعدہ پر ہیں اور وہ اپنے وعدہ کو بہر حال پورا کرنے والا ہے اور اپنے لشکر کی بہر حال مدد کرے گا۔

ملک میں نگران کی منزل مہروں کے اجتماع [تسبیح] میں دھاگے کی ہوتی ہے کہ وہی سب کو جمع کیے رہتا ہے اور وہ اگر ٹوٹ جائے تو سارا سلسلہ بکھر جاتا ہے اور پھر کبھی جمع نہیں ہو سکتا ہے۔ آج عرب اگرچہ قلیل ہیں لیکن اسلام کی بنا پر کثیر ہیں اور اپنے اتحاد و اتفاق کی بنا پر غالب آنے والے ہیں۔ لہذا آپ مرکز میں رہیں اور اس چکی کو انہی کے ذریعہ گردش دیں اور جنگ کی آگ کا مقابلہ انہی کو کرنے دیں۔ آپ زحمت نہ کریں کہ اگر آپ نے اس سرزمین کو چھوڑ دیا تو عرب چاروں طرف سے ٹوٹ پڑیں گے اور سب اس طرح شریک جنگ ہو جائیں گے کہ جن محفوظ مقامات کو آپ چھوڑ کر گئے ہیں، ان کا مسئلہ جنگ سے زیادہ اہم ہو جائے گا۔

ان عجمیوں نے اگر آپ کو میدان جنگ میں دیکھ لیا تو کہیں گے کہ عربیت کی جان یہی ہے۔ اس جڑ کو کاٹ دیا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راحت مل جائے گی اور اس طرح ان کے حملے شدید تر ہو جائیں گے اور وہ آپ میں زیادہ ہی طمع کریں گے۔ اور یہ جو آپ نے ذکر کیا ہے کہ لوگ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے آ رہے ہیں تو یہ بات خدا کو آپ سے زیادہ ناگوار ہے اور وہ جس چیز کو ناگوار سمجھتا ہے، اس کے بدل دینے پر قادر بھی ہے۔ اور یہ جو آپ نے دشمن کے عدد کا ذکر کیا ہے تو یاد رکھیے کہ ہم لوگ ماضی میں بھی کثرت کی بنا پر جنگ نہیں کرتے تھے بلکہ پروردگار کی نصرت اور اعانت کی بنیاد پر جنگ کرتے تھے۔ (نہج البلاغۃ، خطبہ 146)

اہل سنت کہتے ہیں کہ ان خطبوں سے واضح ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیسے پر خلوص تھے اور کس درجے میں ان کے خیر خواہ تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے مابین سنگین نوعیت کا کوئی اختلاف نہ تھا۔

اہل تشیع کے اس ضمن میں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ، جس میں زیدی اور بعض اثنا عشری شیعہ شامل ہیں، تسلیم کرتا ہے کہ ایسا ہی تھا۔ یہ لوگ خلفاء ثلاثہ کو مانتے ہیں اور ان کی شان میں گستاخی نہیں کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ جو غالی شیعہ حضرات پر مشتمل ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے تقیہ سے کام لیا۔ یہ گروہ خلفاء ثلاثہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔

اہل سنت شوری کے ذریعے خلیفہ کے انتخاب سے متعلق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ خط پیش کرتے ہیں:

ومن كتاب له (عليه السلام) إلى معاوية:

إِنَّهُ بَايَعَنِي الْقَوْمُ الَّذِينَ بَايَعُوا أَبَا بَكْرٍ وعُمَرَ وعُثْمَانَ عَلَى مَا بَايَعُوهُمْ عَلَيْهِ فَلَمْ يَكُنْ لِلشَّاهِدِ أَنْ يَخْتَارَ ولا لِلْغَائِبِ أَنْ يَرُدَّ وإِنَّمَا الشُّورَى لِلْمُهَاجِرِينَ والأَنْصَارِ فَإِنِ اجْتَمَعُوا عَلَى رَجُلٍ وسَمَّوْهُ إِمَاماً كَانَ ذَلِكَ لِلَّهِ رِضًا فَإِنْ خَرَجَ عَنْ أَمْرِهِمْ خَارِجٌ بِطَعْنٍ أَوْ بِدْعَةٍ رَدُّوهُ إِلَى مَا خَرَجَ مِنْهُ فَإِنْ أَبَى قَاتَلُوهُ عَلَى اتِّبَاعِهِ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ ووَلاهُ اللَّهُ مَا تَوَلَّى ولَعَمْرِي يَا مُعَاوِيَةُ لَئِنْ نَظَرْتَ بِعَقْلِكَ دُونَ هَوَاكَ لَتَجِدَنِّي أَبْرَأَ النَّاسِ مِنْ دَمِ عُثْمَانَ ولَتَعْلَمَنَّ أَنِّي كُنْتُ فِي عُزْلَةٍ عَنْهُ إِلا أَنْ تَتَجَنَّى فَتَجَنَّ مَا بَدَا لَكَ والسَّلامُ

معاویہ کے نام آپ کا خط: میری بیعت اسی قوم نے کی ہے جس نے ابو بکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی اور اسی طرح کی ہے جس طرح ان کی بیعت تھی کہ نہ کسی حاضر کو نظر ثانی کا حق تھا اور نہ کسی غائب کو رد کر دینے کا اختیار تھا۔ شوری کا اختیار بھی صرف مہاجرین و انصار کو ہوتا ہے لہذا وہ کسی شخص پر اتفاق کر لیں اور اسے امام نامزد کر دیں تو گویا کہ اسی میں رضائے الہی ہے اور اگر کوئی شخص تنقید کر کے یا بدعت کی بنیاد پر اس امر سے باہر نکل جائے تو لوگوں کا فرض ہے کہ اسے واپس لائیں اور اگر انکار کر دے تو اس سے جنگ کریں کہ اس نے مومنین کے راستہ سے ہٹ کر راہ نکالی ہے اور اللہ بھی اسے ادھر پھیر دے گا جدھر وہ پھر گیا ہے۔

معاویہ! میری جان کی قسم! اگر آپ خواہشات کو چھوڑ کر عقل کی نگاہوں سے دیکھیں گے تو مجھے سب سے زیادہ خون عثمان سے پاکدامن پائیں گے اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں اس مسئلہ سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ ہاں اگر آپ حقائق کی پردہ پوشی کر کے الزام ہی لگانا چاہیں تو آپ کو مکمل اختیار ہے۔ والسلام۔ (نہج البلاغہ، مکتوب 6)

شیعہ عالم ذیشان حیدر جوادی جنہوں نے نہج البلاغہ کا سلیس اردو ترجمہ کیا ہے اور مختصر شرح (p. 1998) لکھی ہے، اہل سنت کے استدلال کا جواب دیتے ہوئے اس خطبہ کی تشریح میں لکھتے ہیں: "یہ گذشتہ بیعتوں کی صورتحال کی طرف اشارہ ہے ورنہ اسلام میں خلافت شوری سے طے نہیں ہوتی ہے۔" شیعہ علماء اس ضمن میں نہج البلاغہ کے دوسرے خطبات کو پیش کرتے ہیں جن سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا خلافت پر حق ثابت ہوتا ہے۔

عقل عام سے دلائل

اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں چند تاریخی حقائق اہل تشیع اور اہل سنت سبھی کے نزدیک مسلمہ ہیں:

1۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی میں ایمان لانے والے سبھی صحابہ نے آپ کی حیات طیبہ میں آپ کا پورا ساتھ دیا اور اس ضمن میں بہت سی تکالیف جھیلیں۔ اس بات سے شیعہ بھی انکار نہیں کرتے کہ ان صحابہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت ابو بکر، عمر، عثمان، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں۔

2۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کی اکثریت نے حضرت ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو خلیفہ منتخب کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا نقطہ نظر جو بھی رہا ہو، یہ بات بہر حال مسلمہ ہے کہ انہوں نے ان خلفاء کا ساتھ دیا، ان کے خلاف بغاوت نہیں کی اور حکومتی امور میں متعدد ذمہ داریاں ادا کیں۔ نہج البلاغہ کے خطبات اس بات کے گواہ ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کے ساتھ نہایت خیر خواہانہ رویہ اختیار کیا۔

3۔ سیدنا ابو بکر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے ادوار میں قرآن مجید کی تدوین کی گئی۔ اس عمل میں بہت سے صحابہ نے حصہ لیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس عمل کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس میں شریک رہے۔

4۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں سیدہ عائشہ، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم سے جنگ تو کی مگر اس کے بعد سیدہ عائشہ رضی

اللہ عنہا کا پورا احترام کیا اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے بارے میں اچھے کلمات کہے۔

5۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی۔ ان کے دور حکومت کے پورے عرصے میں سیدنا حسن و حسین رضی اللہ عنہما نے ان کے خلاف کوئی بغاوت نہیں کی اور ان کی خلافت کو تسلیم کیے رکھا۔

ان حقائق کو مانتے ہوئے اگر کوئی شخص سیدنا ابو بکر، عمر، عثمان، عائشہ، طلحہ، زبیر اور معاویہ رضی اللہ عنہم کو معاذ اللہ منافق سمجھتا ہے اور انہیں برا بھلا کہتا ہے تو وہ نہ صرف ان کی شان میں گستاخی کرتا ہے بلکہ یہ سیدنا علی، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کی شان میں گستاخی بھی ہے جنہوں نے حضرت ابو بکر، عمر، عثمان اور معاویہ رضی اللہ عنہم کی بیعت کی اور ان کے خلاف بغاوت نہ کی۔

قرآن مجید جس پر سنی اور شیعہ سبھی کا اتفاق ہے، بھی انہی صحابہ کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ اگر ان صحابہ ہی کو منافق تسلیم کر لیا جائے تو پھر قرآن مجید کی صحت ہی مشکوک ہو جاتی ہے۔ یہ بات عقل سے بعید ہے کہ کوئی شخص ان صحابہ کے اسلام کو تسلیم نہ کرے اور قرآن مجید کے بارے میں یہ مان لے کہ یہ ہم تک قابل اعتماد ذرائع سے پہنچا ہے۔ اسی طرح یہ بھی فکر کا تضاد ہے کہ سیدنا علی، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو تو تسلیم کیا جائے مگر جن حضرات کی انہوں نے بیعت کی ہے اور جن کے ساتھ مل کر اسلام کی خدمت کی ہے، انہیں تسلیم نہ کیا جائے۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، ان دلائل کے جواب میں اہل تشیع حضرات کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ جس میں زیدی اور اثنا عشری شیعہ کا ایک طبقہ شامل ہیں، کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ ان صحابہ کی شان میں گستاخی نہیں کرتے اور ان کی خلافت کو تسلیم کر لیتے ہیں، اگرچہ یہ افضل سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہی کو سمجھتے ہیں۔ دوسرا گروہ جو کہ غالی شیعوں پر مشتمل ہے، ان دلائل کے جواب میں یہی کہتا ہے کہ سیدنا علی، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم نے بطور تقیہ ایسا کیا۔ اہل تشیع کے نزدیک تقیہ دین کا اہم اصول ہے جس کا مطلب ہے اپنا دین چھپانا۔ اس کی تفصیل کا مطالعہ ہم اگلے اسباق میں کریں گے۔

اسائن منٹس

1. اہل تشیع کے نقطہ نظر کے مطابق خلافت حضرت علی کا حق تھا؟ اس معاملے میں ان کے دلائل بیان کر کے اہل سنت کا جواب بیان کیجیے۔
2. صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلافت سے متعلق کردار کے بارے میں اہل تشیع اور اہل سنت کے موقف میں کیا فرق ہے؟

تعمیر شخصیت

کسی کی عدم موجودگی میں اس کی کمزوریوں کو بیان کرنے کا نام غیبت ہے۔ قرآن مجید نے اسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔

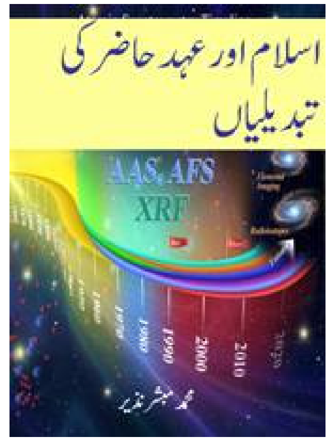

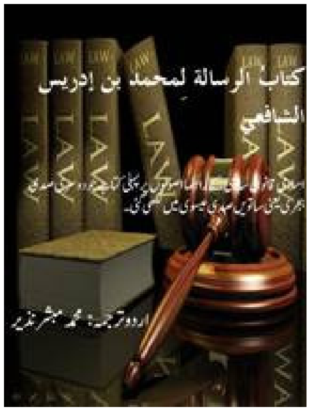

[1] تمنا عمادی۔ امام طبری اور امام زہری۔

[2] تفہیم القرآن، زیر آیت 24:55

سبق 5: بعد کے ادوار کی تاریخ

عہد صحابہ اور اس کے بعد کی تاریخ کے بارے میں اہل تشیع اور اہل سنت کے مابین بہت سے امور پر اتفاق پایا جاتا ہے اور بہت سے امور پر اختلاف۔ مناسب ہو گا کہ پہلے ہم پورے تاریخی لینڈ اسکیپ کو بیان کر دیں تا کہ بات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ یہ وہ واقعات ہیں جو تواتر سے ثابت ہیں اور ان میں اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ تاریخ کی کسی بھی کتاب میں ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

دور جاہلیت کے مکہ کی سیاست میں بنو امیہ اور بنو ہاشم دو ایسے خاندان تھے جن میں سیاسی چپقلش چل رہی تھی۔ امیہ اور ہاشم، جو پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں گزرے ہیں، میں چچا بھتیجے کا تعلق تھا مگر قریش کی سیادت کے معاملے میں ان میں اختلاف ہو گیا جو بعد میں ان کی اولاد میں بھی جاری رہا۔ ہاشم کے پڑپوتے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جب آپ نے اعلان نبوت فرمایا تو بنو امیہ نے یہ سمجھا کہ یہ شاید ہم پر برتری ثابت کرنے کی ایک کوشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنو امیہ کے اکثر لوگوں نے آپ کی مخالفت کی مگر ان کے بعض صالح افراد ایمان لے آئے جن میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ غزوہ بدر میں کفار قریش کے لیڈروں کی ہلاکت کے بعد قریش بالخصوص بنو امیہ کی قیادت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آئی جنہوں نے غزوہ احد اور غزوہ خندق میں قریش کے لشکروں کی قیادت کی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیٹی سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا، جو حبشہ میں اپنے شوہر کے مرنے کے بعد شدید کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہی تھیں، تو ابو سفیان کا دل نرم پڑ گیا۔ فتح مکہ کے موقع پر انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا اور بنو امیہ اور بنو ہاشم کے اختلافات دب گئے۔

حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں یہ اختلافات دبے رہے کیونکہ ان دونوں حضرات کا تعلق قریش کے دوسرے خاندانوں سے تھا۔ اس زمانے میں بنو امیہ کی قیادت حضرت عثمان اور بنو ہاشم کی قیادت حضرت عباس اور علی رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر بزرگوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس وجہ سے کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت دور اندیش تھے اور انہیں یہ خدشہ تھا کہ ان کی وفات کے بعد یہ جھگڑا کہیں دوبارہ زندہ نہ ہو جائے۔ اس وجہ سے وہ چاہتے تھے کہ اگلا خلیفہ بھی ان دونوں خاندانوں سے نہ ہو۔ اس ضمن میں انہوں نے خواہش کا اظہار بھی کیا کہ اگر ابو عبیدہ یا سالم مولی ابو حذیفہ (رضی اللہ عنہم) میں سے کوئی ایک زندہ ہوتا تو وہ اسے خلیفہ نامزد کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے چھ افراد پر مشتمل ایک شوری بنا دی جس نے اگلے خلیفہ کا فیصلہ کرنا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو بھی سات آٹھ برس تک کوئی مسئلہ نہ ہوا۔ آپ گورنروں اور دیگر عہدے داروں کا انتخاب ٹھیک میرٹ پر کیا کرتے تھے۔ جو شخص میرٹ پر پورا اترتا، وہ کسی بھی خاندان کا ہوتا، اسے عہدہ ملتا۔ بنو امیہ کے لوگ چونکہ حکومتی امور کا تجربہ رکھتے تھے، اس وجہ سے ان کے بعض افراد سیدنا ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں بھی گورنر مقرر ہوئے

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان افراد کو گورنر مقرر کیا یا کیے رکھا کیونکہ آپ کسی اہل شخص کو محض اس وجہ سے محروم نہ رکھنا چاہتے تھے کہ وہ آپ کا رشتہ دار تھا۔ ان حضرات، جن میں حضرت معاویہ، سعید بن عاص، عبداللہ بن عامر اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہم شامل تھے، نے اپنی اہلیت ثابت کرتے ہوئے اپنے ماتحت علاقوں میں زبردست حسن انتظام سے کام لیا اور مزید علاقے سلطنت اسلامیہ میں شامل کیے۔ حضرت عبداللہ بن سعد جب مصر کے گورنر بنے تو انہوں نے دو تین سال کے اندر ہی موجودہ مصر سے لے کر تیونس تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے شام کے گورنر تھے، آپ نے ایک طاقتور بحری فوج بنائی اور رومن ایمپائر سے موجودہ ترکی، قبرص اور اٹلی کے بعض علاقے چھین لیے۔ عبداللہ بن عامر اور سعید بن عاص رضی اللہ عنہما نے، ایک ایسے دور میں جب مسلمانوں پر ہر جانب سے دولت کی برسات ہو رہی تھی، نہایت ہی سادہ طرز زندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ابو بکر اور عمر کی یاد تازہ کر دی۔ سعید بن عاص نے وسطی ایشیا کے بہت سے علاقے فتح کیے۔

ان تمام گورنروں کی پرفارمنس یہ ظاہر کرتی ہے کہ ان کا انتخاب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ٹھیک میرٹ پر کیا تھا۔ تاہم بنو ہاشم کے بعض دنیا پرست لوگوں میں اس سے بے چینی پائی جاتی تھی۔ اس بے چینی کو اس وجہ سے اظہار کا کوئی راستہ نہ مل رہا تھا کہ بنو ہاشم کی قیادت حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے آخرت پرست اور سادہ دل بزرگ کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی سادگی، دنیاوی عہدوں اور دولت سے بیزاری ضرب المثل کی حد تک مشہور ہے۔ آپ بدستور حضرت عثمان کے دست راست بنے رہے اور حکومتی امور میں نہایت خلوص اور دیانتداری کے ساتھ مشورے دیتے رہے۔

عرب میں اس زمانے میں کثیر تعداد میں ایسے لوگ موجود تھے جو دل سے ایمان نہ لائے تھے اور دنیا پرستانہ مقاصد (Ambitions) اپنے دل میں رکھتے تھے۔ انہیں یہ دیکھ دیکھ کر تکلیف ہوتی تھی کہ مال و دولت کی جو ریل پیل مسلم دنیا میں ہو رہی ہے، اس پر دوسرے کیوں قابض ہیں؟ وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح اقتدار پر قبضہ کر کے بیت المال پر کنٹرول کر لیا جائے۔ انہوں نے ایک خفیہ تحریک شروع کی جس کی جڑیں عراق، مصر اور یمن میں پھیلتی چلی گئی۔ یہ ہم خیال لوگ آہستہ آہستہ اکٹھے ہوتے چلے گئے۔ طبری کی روایات کے مطابق کوفہ میں ان کے چند اراکین گرفتار ہو گئے اور انہیں کچھ عرصہ شام میں قید رکھ کر ان کی اصلاح کی کوشش بھی کی گئی مگر اس سے اس تحریک پر بڑا فرق نہ پڑا۔ ماننا پڑے گا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس تحریک کی تفصیلات بروقت نہ جان سکے اور بہت دیر ہو گئی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ (602-680/60H) نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اجازت طلب کی کہ وہ اہل شام کی ایک فوج مدینہ بھیج دیں ورنہ خلیفہ خود شام میں منتقل ہو جائیں لیکن خلیفہ راشد نے ان دونوں تجاویز کو مسترد کر دیا کیونکہ آپ حرم نبوی میں خونریزی سے بچنا چاہتے تھے اور آپ اپنا آخری وقت بھی دیار نبوی میں گزارنا چاہتے تھے۔

35/656 میں صورتحال یہ تھی کہ اسلامی سلطنت بہت دور تک پھیل چکی تھی اور مسلم افواج زیادہ تر سرحدوں پر تھیں۔ شہروں میں بالعموم بہت ہی کم فوجیں تھیں جو فوج کم اور پولیس زیادہ کا رول ادا کرتی تھی۔ تحریک کے سرکردہ لوگوں کا منصوبہ یہ تھا کہ مدینہ پر ایسے

وقت میں اچانک حملہ کر کے خلیفہ کو شہید کر دیا جائے اور ان کی جگہ کسی ایسے صحابی کو خلیفہ بنا دیا جائے جس کی خلافت پر لوگ بھی متفق ہو جائیں اور اسے وہ بطور کٹھ پتلی حکمران اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ پس پردہ رہ کر حکمرانی کریں۔ اس مقصد کے لیے ان میں بعض نے حضرت طلحہ، بعض نے حضرت زبیر اور بعض نے حضرت علی رضی اللہ عنہم کا نام پیش کیا اور باہمی بحث و تمحیص کے بعد بالآخر وہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام پر متفق ہو گئے۔

انہوں نے اس مسلح بغاوت کے لیے ایسے وقت کا انتخاب کیا جب مسلمانوں کی کثیر تعداد حج کے لیے گئی ہوئی تھی اور مدینہ میں بہت ہی کم مرد موجود تھے۔ باغیوں نے مدینہ منورہ کا محاصرہ کر لیا اور پھر اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ بھی کر لیا اور ان کے گھر کھانے پینے کی چیزیں بھیجنے پر پابندی لگا دی۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ خلیفہ اقتدار چھوڑ دیں۔ ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے کھانا اور پانی ان کے گھر بھجوانے کی کوشش کی لیکن باغیوں نے تیر مار کر مشکیزہ پھاڑ دیا اور اشیاء کو لوٹ لیا۔ اس موقع پر حضرت علی نے اپنے دونوں ساتھیوں طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کی مدد سے بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا اور ان تمام حضرات نے اپنے اپنے بیٹوں حسن، حسین، عبداللہ بن زبیر اور موسی بن طلحہ رضی اللہ عنہم کو خلیفہ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی۔ ایک موقع پر باغیوں کے حملے میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ زخمی بھی ہوئے۔ یہ حضرات امیر المومنین کے دروازے کا پہرہ دے رہے تھے کہ باغیوں کا ایک گروہ پچھلی دیوار پھاند کر آیا اور انہوں نے 18 ذوالحجہ 35ھ کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا اور انہیں بچاتے ہوئے ان کی اہلیہ نائلہ رضی اللہ عنہا زخمی ہوئیں۔

اس کے فوراً بعد باغیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ آپ نے پہلے انکار کر دیا لیکن پھر بعض مصالح کے پیش نظر خلافت کو قبول کیا۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ آپ کچھ وقت حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ مسلمانوں کی قوت کو اکٹھا کر کے ان باغیوں سے نجات حاصل کر سکیں۔ باغیوں کے عزائم سے ایسا لگتا تھا کہ وہ دیگر مخلص صحابہ کو شہید کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کا راستہ صاف ہو جائے۔ اس صورتحال کے پیش نظر حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما مدینہ سے نکل کر بصرہ کی طرف چلے گئے جہاں مخلص مسلمانوں کی ایک بڑی فوج موجود تھی۔ دوسری طرف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جو حج کے لیے مکہ گئی ہوئی تھیں، کو بھی جب یہ خبریں پہنچیں تو آپ بھی بصرہ کی طرف چل پڑیں۔ یہاں ایک بہت بڑا لشکر اکٹھا ہو گیا جس کی قیادت سیدہ عائشہ، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کر رہے تھے۔ اس لشکر کا مطالبہ یہ تھا کہ قاتلین عثمان سے قصاص لیا جائے تاکہ فتنہ و فساد کا خاتمہ ہو اور بغاوت کو کچلا جا سکے۔

ادھر مدینہ میں صورتحال یہ تھی کہ مخلص مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور باغی معاملات پر چھائے ہوئے تھے۔ سیدنا حسن اور ابن عباس رضی اللہ عنہم جیسے مخلص صحابہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ یہی دیا کہ وہ فی الحال پوری توجہ اپنے اقتدار پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے کریں اور مدینہ سے باہر نہ نکلیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا خیال غالباً یہ تھا کہ بصرہ پہنچ کر مخلص مسلمانوں کی مدد لے کر ان باغیوں سے چھٹکارا پایا جائے۔ چنانچہ آپ بھی بصرہ کی جانب نکلے اور آپ کے لشکر میں بڑی تعداد ان باغیوں کی تھی جنہوں نے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ جب آپ بصرہ کے قریب پہنچے تو دونوں لشکر آمنے سامنے آئے۔ سیدنا علی، حضرات طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے جا کر ملے اور مذاکرات شروع کیے۔ فریقین ان مذاکرات میں ایک نتیجے پر پہنچ گئے اور اتفاق رائے ہو گیا۔

اب باغیوں کو اپنی موت نظر آ رہی تھی چنانچہ انہوں نے رات کے وقت دونوں لشکروں پر بیک وقت حملہ کر دیا۔ ہر فریق یہ سمجھا کہ فریق مخالف نے بدعہدی کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بے مثال حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنگ رکوا دی لیکن اس وقت تک 5000 مسلمان دونوں جانب سے شہید ہو چکے تھے جن میں حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہ بھی شامل تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک باغی نے حضرت علی کو حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت کی خبر دی تو آپ نے اسے جہنم کی وعید سنائی۔ جب حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے آپ کے پاس آئے تو آپ نے ان کے بارے میں بھی کلمات خیر کہے۔ یہ جنگ "جنگ جمل" کہلاتی ہے۔

دوسری طرف باغیوں کا ایک خفیہ گروہ شام میں بھی کام کر رہا تھا۔ اس نے یہ پراپیگنڈا کیا کہ باغیوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو نعوذ باللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایماء پر قتل کیا ہے۔ اہل شام، جو کہ نہایت ہی مخلص مسلمان تھے، اس کی زد میں آ گئے۔ شام کے گورنر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ آپ قاتلین عثمان کو سزا دیں اور اس مسئلے پر فریقین کے درمیان کئی ماہ تک خط و کتابت جاری رہی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ ان کے لشکر میں بڑی تعداد میں باغی شریک ہو چکے تھے۔ ایک موقع پر آپ نے قاتلین عثمان کا تعین کرنا چاہا تو ہزاروں لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ اعلان کرنے لگے کہ ہم قاتلین عثمان ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ شام کی طرف بڑھے جہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ایک طاقتور فوج موجود تھی۔ صفین کے مقام پر فریقین کے مابین ایک جنگ ہوئی۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، جو مصر کے فاتح تھے، نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو جنگ ختم کرنے کی ایک تدبیر بتائی اور وہ یہ تھی کہ نیزوں پر قرآن بلند کر لیے جائیں اور یہ مطالبہ کیا جائے کہ فیصلہ قرآن کی روشنی میں مذاکرات کے ذریعے کیا جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا اور مذاکرات کے ذریعے فیصلہ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ دونوں فریقوں کی جانب سے ایک ایک حکم (Arbitrator) مقرر ہوا جنہوں نے مل کر فیصلہ کرنا تھا۔ یہ حکم کسی نتیجے پر پہنچ نہ سکے لیکن فائدہ یہ ہوا کہ جنگ ختم ہو گئی۔ تاریخ میں اس واقعہ کو "تحکیم" کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر باغیوں کا ایک بہت بڑا گروپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے الگ ہو گیا کیونکہ وہ کسی صورت بھی صلح کرنا نہ چاہتے تھے۔ یہ لوگ "خوارج" کہلائے اور انہوں نے مذاکرات کے ذریعے فیصلہ کرنے کو کفر قرار دیتے ہوئے حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما، دونوں پر کفر کا فتوی عائد کیا اور عراق میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس گروپ کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر عالم کو ان کے ساتھ گفتگو کے

لیے بھیجا۔ ان میں سے بہت سے خارجی قائل ہو بھی گئے لیکن ایک گروہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔

بحیثیت ایک خلیفہ راشد، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان خوارج کے خلاف مزید کوئی کاروائی نہ کی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد خوارج نے تمام مسلمانوں پر کفر کا فتوی عائد کیا اور ان کے جان و مال کو لوٹنا جائز قرار دے دیا۔ ان کے مسلح جتھوں نے شہری آبادیوں اور قافلوں پر حملے شروع کر دیے۔ اب کاروائی ناگزیر تھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے نہروان کے مقام پر ان کے ساتھ جنگ کی اور اس گروہ کا بڑی حد تک قلع قمع کر کے ان کے مرکز کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد ان کے باقی ماندہ افراد تتر بتر ہو گئے۔

ان تین جنگوں کے نتیجے میں قاتلین عثمان کی تحریک کی طاقت بڑی حد تک کمزور پڑ گئی۔ ایک طرف تو خوارج اس تحریک سے الگ ہوئے اور دوسری جانب ان کے باقی ماندہ گروہ کی بڑی تعداد جنگ جمل، صفین اور نہروان میں قتل ہو گئی۔ اس کے علاوہ مخلص مسلمان بھی بڑی تعداد میں اس جنگ میں شہید ہوئے مگر ان کی قربانی سے بڑی حد تک یہ فتنہ کمزور پڑ گیا۔ اہل تشیع اور اہل سنت کی مرتب کردہ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو فریق موجود رہا، وہ بھی آپ کا سخت نافرمان تھا۔ نہج البلاغہ میں آپ کا ارشاد ملتا ہے کہ معاویہ تم میں سے دس دس لوگ لے کر اگر اپنا ایک ایک ساتھی مجھے دے دیں تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔

خارجیوں کا گروہ ختم نہیں ہوا تھا بلکہ ان کی تحریک زیر زمین ابھی باقی تھی۔ 40/660 میں انہوں نے منصوبہ بنایا کہ ایک ہی رات میں حضرت علی، معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کو شہید کر دیا جائے تاکہ اقتدار انہیں مل سکے۔ اس مقصد کے لیے ان کے خود کش حملہ آور ان تینوں حضرات پر بیک وقت حملہ آور ہوئے۔ حضرت معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما تو اس حملے میں بچ گئے مگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ آپ کی شہادت کے بعد لوگوں نے آپ کے بیٹے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا۔ آپ نے محض چھ ماہ تک حکومت کرنے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں ایک سادہ کاغذ دستخط کر کے بھیجا کہ وہ اس پر جو شرائط چاہیں لکھ لیں، وہ انہیں قابل قبول ہوں گی۔ اس صلح کے بعد مسلمان اکٹھے ہو گئے۔ قاتلین عثمان کا وہ حصہ جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ (3-48/624-669) کے ساتھیوں میں شامل تھا، دب کر رہ گیا اور ان میں سے جن لوگوں کی نشاندہی ہو سکی، انہیں سزا دی گئی۔ خوارج نے البتہ گوریلا جنگ جاری رکھی لیکن بحیثیت مجموعی اگلے بیس سال مکمل امن رہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی پوری توجہ بیرونی محاذ کی جانب کیے رکھی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور (40-60/660-680) خوشحالی کا دور تھا۔ حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے تعلقات ان سے بہت اچھے رہے اور وہ بھی باپ کی طرح ان کی سرپرستی کرتے رہے۔ ان حضرات نے بھی سیاست کا میدان چھوڑ کر اپنی پوری توجہ لوگوں کی دینی تعلیم و تربیت پر لگا دی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا یزید بر سر اقتدار ہوا تو عراق کے صوبہ میں بغاوت پیدا ہو گئی۔ اس وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو چکا تھا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ ابھی زندہ تھے۔ اہل کوفہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دعوت دی کہ وہ آ کر عراق کا اقتدار سنبھال لیں۔ آپ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ عراق کی طرف

گئے تو کوفہ کے نواح میں "سانحہ کربلا" پیش آیا جس میں آپ کو اپنے خاندان سمیت شہید کر دیا گیا۔

دو اڑھائی سال تک حکومت کے بعد 64/684 میں یزید حادثاتی موت کا شکار ہوا تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے مکہ میں اپنی حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا۔ ان کی حکومت حجاز اور عراق کے علاقوں پر قائم ہو بھی گئی۔ یزید کے بعد اس کا بیمار بیٹا معاویہ ثانی خلیفہ بنا لیکن بیس بائیس دن میں وہ بھی انتقال کر گیا۔ معاویہ ثانی کے بعد مروان کو حکومت ملی جو بنو امیہ ہی سے تھے۔ انہیں بھی ایک سال ہی حکومت کا موقع ملا اور ان کے بعد ان کا بیٹا عبدالملک بن مروان خلیفہ بنا۔ عبدالملک اور عبداللہ بن زبیر، جو بچپن کے دوست تھے، کی افواج کے درمیان جنگ ہوئی جس میں عبدالملک کو فتح حاصل ہوئی اور ایک مرتبہ پھر عالم اسلام عبدالملک کی قیادت میں اکٹھا ہو گیا۔

عبدالملک کے دور (65-86/685-705) سے صحیح معنوں میں بادشاہت کا آغاز ہوا اور بنو امیہ کا اقتدار مستحکم ہوا۔ ان کے بعد ان کے چار بیٹے یکے بعد دیگرے خلیفہ بنے۔ اسی دوران ایک مختصر وقفے (98-101/717-720) میں عبدالملک کے بھتیجے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو حکومت ملی تو انہوں نے خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی۔ بقیہ ادوار میں ملا جلا رجحان رہا۔ خوارج اور بعض دیگر گروہ مسلسل بغاوتیں کرتے رہے جو ناکام ہوتی رہیں۔

دوسری جانب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد بنو ہاشم دو بڑے گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک گروہ علویوں کا تھا جس کی قیادت پہلے حضرت حسن (3-49/625-669) اور پھر سیدنا حسین (4-61/626-680) رضی اللہ عنہما کے ہاتھ میں تھی۔ واقعہ کربلا کے بعد یہ قیادت ان کے سوتیلے بھائی محمد بن حنفیہ (16-81/637-700) کے ہاتھ میں آئی۔ انہوں نے بھی اپنے خاندان کو سیاسی سرگرمیوں کا حصہ بننے سے بچائے رکھا تاہم ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں نے ایک بغاوت کی قیادت کی۔ ان کا گروہ "کیسانیہ" کہلایا جو بعد میں بنو عباس کی تحریک میں ضم ہو گیا۔ علویوں کی دوسری شاخ کے سربراہ حضرت علی بن حسین زین العابدین رضی اللہ عنہما (38-95/659-712) تھے جنہوں نے ہر قسم کی بغاوت سے اپنے حامیوں کو روکا البتہ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے زید رحمہ اللہ نے بغاوت کی۔ ان کے بیٹے محمد باقر (57-114/676-733) اور پوتے جعفر الصادق (83-148/702-765) نے البتہ ہر قسم کی بغاوت سے اجتناب کیا۔

بنو ہاشم کا دوسرا گروہ عباسیوں کا تھا جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد تھے۔ انہوں نے دوسری صدی ہجری کے آغاز میں بنو امیہ کے خلاف ایک تحریک منظم کی جس میں علویوں کے ان طبقات کو ملا لیا جو بغاوت کرنا چاہتے تھے۔ 132/750 میں ایک زبردست بغاوت کے نتیجے میں بنو امیہ کے نوے سالہ اقتدار (40-132/660-750) کا خاتمہ ہوا۔ عباسیوں نے اقتدار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد کو منتقل کرنے کی بجائے اپنی حکومت قائم کر لی جو کسی نہ کسی شکل میں 918/1513 تک قائم رہی۔

اہل تشیع کے مختلف گروہوں کو اس دوران کئی مرتبہ اپنی حکومتیں قائم کرنے کا موقع بھی ملا۔ جب عباسی سلطنت کمزور پڑی تو مختلف علاقوں میں سلاطین نے اپنی حکومتیں قائم کر لیں جن میں سے بعض شیعہ تھے۔ 322-447/934-1055 میں عراق میں آل بویہ،

297-567/909-1171 میں مصر میں فاطمی سلطنت اور 906-1148/1501-1736 کے دوران ایران میں صفوی سلطنتیں شامل تھیں۔

مختلف فریقوں کے نقطہ ہائے نظر

تاریخ کے جو واقعات اوپر ہم نے بیان کیے ہیں، ان کے بارے میں اہل سنت اور اہل تشیع کے مورخین متفق ہیں کہ یہ واقعات اسی طرح پیش آئے۔ ان واقعات کی جزوی تفصیلات کے بارے میں ان کے مابین شدید اختلاف پائے جاتے ہیں جس سے ان کا زاویہ نظر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے ہم ایک چارٹ پیش کر رہے ہیں جس میں فریقین کے نقطہ ہائے نظر کا تقابل پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے کا تیسرا گروہ "خوارج" ہیں جو وقت کے ساتھ ختم ہو گئے مگر ان کے نقطہ نظر کا جائزہ لینا بھی تقابل کے لیے مفید رہے گا۔

معاملہ	اہل سنت	اہل تشیع	خوارج
حضرات ابو بکر، عمر اور عثمان کی خلافت (11-35/632-656)	بالکل جائز تھی کیونکہ اسلام میں خلافت کی بنیاد شوری ہے	ناجائز تھی کیونکہ خلافت حضرت علی کا حق تھا	بالکل جائز تھی کیونکہ اسلام میں خلافت کی بنیاد شوری ہے
خلفائے ثلاثہ کے دور میں حضرت علی کا کردار	آپ تینوں خلفاء کے مخلص ساتھی اور حمایتی تھے	آپ نے بطور تقیہ مجبوراً ان کے اقتدار کو قبول کیا تھا	آپ تینوں خلفاء کے مخلص ساتھی اور حمایتی تھے
قتل عثمان (35/656)	تاریخ اسلامی کا سب سے بڑا ظلم تھا	پوزیشن واضح نہیں۔ بعض شیعہ اسے جائز سمجھتے ہیں اور بعض ناجائز۔	پوزیشن واضح نہیں۔ اکثر خوارج اسے جائز سمجھتے ہیں اور بعض ناجائز۔
خلافت علی (36-40/656-660)	بالکل جائز تھی اور آپ چوتھے خلیفہ راشد ہیں کیونکہ آپ شوری کے ذریعے خلیفہ بنے	آپ کا حق تھی کیونکہ آپ وصی الرسول اور پہلے جائز خلیفہ تھے	واقعہ تحکیم تک جائز تھی اور اس کے بعد ناجائز
جنگ جمل (36/656)	جنگ کے ذمہ دار باغی تھے جنہوں نے فریقین پر حملہ کر کے جنگ شروع کروائی	جنگ کے ذمہ دار عائشہ، طلحہ اوز بیر تھے	جنگ کے ذمہ دار عائشہ، طلحہ اوز بیر تھے

معاملہ	اہل سنت	اہل تشیع	خوارج
جنگ صفین (36/656)	حضرت معاویہ کا مقصد باغیوں کی طاقت کا زور توڑ کر نیک نیتی سے حضرت علی کو ان کے چنگل سے نکالنا تھا	معاویہ کا مقصد اقتدار پر قبضہ کر کے حضرت علی کو محروم کرنا تھا	معاویہ کا مقصد اقتدار پر قبضہ کرنا تھا
واقعہ تحکیم	حضرت علی، معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم مخلص تھے اور جنگ کے خاتمے کے لیے صلح کرنا چاہتے تھے	واقعہ تحکیم حضرت معاویہ اور عمرو بن عاص کی سازش تھی	واقعہ تحکیم کی وجہ سے علی، معاویہ ، عمرو بن عاص اور وہ تمام صحابہ کافر ہو گئے جو اس پر رضامند ہوئے۔
خوارج کے ساتھ جنگ (37/657)	حضرت علی حق پر تھے	حضرت علی حق پر تھے	خوارج حق پر تھے جبکہ حضرت علی نے ظلم اور کفر کیا
قتل علی (40/660)	خوارج کا بدترین ظلم تھا	خوارج کا بدترین ظلم تھا	جائز تھا
حضرات حسن و معاویہ کی صلح (40/660)	دونوں حضرات کا عظیم کارنامہ	پسند نہیں کرتے	پسند نہیں کرتے
حضرت معاویہ کا دور (40-60/660-680)	تاریخ کا ایک روشن دور	تاریخ کا ایک تاریک دور	تاریخ کا ایک تاریک دور
یزید کا دور (61-64/680-683)	قابل تنقید	تاریخ کا تاریک ترین دور	قابل تنقید
عبد الملک بن مروان اور عبد اللہ بن زبیر کے مابین جنگ (65-72/685-692)	عبد اللہ بن زبیر حق پر تھے (ایک اقلیتی گروہ عبد الملک کو حق پر سمجھتا ہے)	غیر جانبدار مگر ابن زبیر کو امویوں سے بہتر سمجھتے ہیں	غیر جانبدار
بعد کے بنو امیہ کا دور (65-132/682-750)	قابل تنقید خلفاء جنہوں نے بعض کارنامے بھی انجام دیے	سخت ظالم حکمران	سخت ظالم حکمران

معاملہ	اہل سنت	اہل تشیع	خوارج
عمر بن عبد العزیز کا دور (98-101/717-720)	خلافت راشدہ کا دور	قابل تعریف	قابل تعریف
امویوں کے خلاف عباسی بغاوت (132/750)	بعض درست اور بعض غلط سمجھتے ہیں	شروع میں حمایت کی مگر بعد میں مخالفت	رائے معلوم نہیں ہو سکی
عباسی سلطنت (132-918/750-1517)	بعض بادشاہ اچھے اور بعض برے تھے تاہم انہیں عالم اسلام کے خلیفہ کی حیثیت سے قبول کیا گیا	بعض گروہ بغاوتیں کرتے رہے جبکہ بعض نے مجبوراً ان کے اقتدار کو قبول کیا	بغاوتیں کرتے رہے

اب ہم ان تینوں فریقوں کے نقطہ ہائے نظر کو کچھ تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

اہل تشیع کا نقطہ نظر

اہل تشیع بالعموم اس تاریخ کو ایک مسلسل نظریہ سازش کی عینک سے دیکھتے ہیں جس میں صحابہ کرام، بنو امیہ اور بنو عباس کے حکمران طرح طرح کی سازشیں اور بسا اوقات کھلی جنگ کر کے ائمہ اہل بیت کو خلافت سے محروم رکھتے ہیں۔ شیعہ بنو امیہ کے خاص طور پر دشمن ہیں اور ان کے ہر حکمران کی مذمت کرتے ہیں۔ اس سے استثنا صرف عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جن کی شیعہ بھی تعریف کرتے ہیں۔ [دیکھیے جسٹس امیر علی (1849-1928) کی کتاب Spirit of Islam] بعد کے ادوار کے بہت سے سنی حکمرانوں کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ یہ لوگ اہل تشیع پر ظلم کرتے تھے۔ جو لوگ اہل سنت کے ہاں ہیرو کا درجہ رکھتے ہیں، وہ اہل تشیع کے نزدیک ولن ہیں۔ خلفائے ثلاثہ کے علاوہ دیگر صحابہ جیسے حضرت خالد بن ولید اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بھی اہل تشیع کے ہاں شدید تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔

بعض اہل تشیع امام ابو حنیفہ (80-150/699-767) اور امام مالک (93-179/711-795) کو بھی سازشی قرار دیتے ہیں جنہوں نے امام جعفر صادق رحمہم اللہ (83-148/702-765) سے فقہ کا علم سیکھ کر اپنے اپنے فقہی مکتب فکر بنا لیے اور اس کی مدد سے عباسی حکمرانوں کی قربت اختیار کر لی۔[1]

اہل سنت کا نقطہ نظر

بالکل اسی طرح بہت سے اہل سنت بھی نظریہ سازش کی عینک سے تاریخ کو دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب عجمی ممالک یعنی عراق اور

ایران اسلام کی فوجی قوت کے سامنے سرنگوں ہوئے تو انہوں نے سازش کا راستہ اپنایا۔ اسے وہ "عجم کی سازش" کا عنوان دیتے ہیں۔ یہ اہل عجم ہی تھے جنہوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کروا کر ایران و عراق میں اپنی شکست کا بدلہ لیا۔ حضرت عمر کا قاتل ابولؤلؤ فیروز ایک ایرانی تھا جو ایک جنگ میں گرفتار ہو کر مدینہ لایا گیا۔ 23/645 میں اس نے ایرانی جنرل ہرمزان سے مل کر سازش کی اور عین حالت نماز میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر دو دھاری خنجر سے عین اس وقت حملہ کیا جب آپ نماز کے لیے صفیں درست کروا رہے تھے۔ آپ زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔ فیروز نے مزید بیس بائیس افراد کو زخمی کیا مگر بالآخر اس پر قابو پا لیا گیا تو اس نے خودکشی کر لی۔

اہل سنت کا کہنا یہ ہے کہ یہ عجم کی پہلی سازش تھی اور وہ اس کا الزام اہل تشیع پر رکھتے ہیں۔ ان کا دعوی ہے کہ اہل تشیع فیروز کا بہت احترام کرتے ہیں۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ کہتے ہیں کہ اب بھی ایران کے شہر کاشان میں ابولؤلؤ فیروز کا مقبرہ موجود ہے جس کی شیعہ بہت تعظیم کرتے ہیں۔ ہمیں اس معاملے میں شیعہ علماء کے آفیشل نقطہ نظر کا علم نہیں ہو سکا تاہم انٹرنیٹ پر تلاش کرتے ہوئے فیروز کے مقبرے کی کچھ تصاویر ضرور ملی ہیں جس پر حالیہ برسوں میں ایک جھگڑا کھڑا ہوا۔ 2007 میں عرب علماء کے ایک گروہ نے ایران سے سرکاری سطح پر یہ مطالبہ کیا کہ وہ فیروز کے مقبرے کو گرا دیں، جس کے نتیجے میں ایران میں احتجاجی مظاہرے شروع ہوئے۔ محمد علی ای، جو کہ ایرانی ورثے کی حفاظت میں شامل تحریک کا حصہ ہیں، نے اس موضوع پر ایک مضمون لکھا، جس کے چند اقتباسات یہ ہیں:

> فیروزان کا مقبرہ جو کہ امام ابولؤلؤ کہلاتے ہیں، صوبہ اصفہان کے شہر کاشان میں ہے اور اس وقت زائرین کے لیے بند کیا جا رہا ہے۔ یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ اس مقبرے کو اسلامی حکومت توڑنے کا حکم دے رہی ہے۔
>
> ایرانیوں کا ایک بڑا مجمع منگل، 26 جون (2007) کو گورنر کے دفتر کے باہر اکٹھا ہوا اور اس نے ایرانی ورثے اور ایک ایسے مزار کی ممکنہ تباہی اور بندش کے خلاف آواز اٹھائی جو کہ ساتویں صدی عیسوی میں عرب حملہ آوروں کے خلاف ایرانی جدوجہد کی علامت ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ [فیروز] ایک قابل احترام صوفی اور شیعہ تھے۔ عمر بن خطاب، مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ 645 میں فیروز کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے ۔۔۔۔ " فیروزان کا یہ عمل اس ظلم کے خلاف رد عمل تھا جو عرب مسلمان حملہ آوروں نے ایران میں کیے تھے اور جس کے نتیجے میں ہمارے ملک میں قتل عام، ریپ اور لوٹ مار کے واقعات ہوئے۔ ہم ایرانی اپنے خلاف ہونے والے جرائم کو نہ تو کبھی معاف کریں گے اور نہ ہی بھولیں گے۔" ایک احتجاج کرنے والے نے کہا۔
>
> بعض عرب اور مسلمان تاریخ دان، فیروزان کی بہادری اور ہیروازم پر پردہ ڈالنے کے لیے دعوی کرتے ہیں (جو کہ ابن شہاب کی بیان کردہ روایت ہے کہ) فیروزان نے عمر کو جزیہ پر بحث کرنے کی وجہ سے قتل کیا تھا۔ صفوی دور حکومت میں جب شیعہ مسلمان اقتدار میں آئے، تو اس خاندان نے انہیں [فیروزان کو] بابا شجاع الدین (مذہب کے لیے بہادری کا مظاہرہ کرنے والا) کا لقب دیا اور یہ دعوی کیا کہ وہ ایک پکے شیعہ اور شہید تھے۔

ایک اور احتجاج کرنے والے نے غصے میں کہا: "وہ کہتے ہیں کہ وہ یہاں دفن نہیں ہے۔۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ مسلمان ہی نہیں تھے۔۔۔ تو پھر کیا ہوا؟ کچھ بھی ہے، یہ مقبرہ ان کی علامت ہے، یہ ہمارے مذہب اور غیر مہذب حملہ آوروں کے خلاف جدوجہد کی علامت ہے۔" ایک اور احتجاج کرنے والے نے اضافہ کیا: "اگر ابولولو کوئی عرب ہوتا تو وہ اسے گرانے کی بجائے اس کے مزار پر سونے کا گنبد بنواتے۔ لیکن نہیں، نہیں۔۔۔ وہ اس مقبرے کو گرانا چاہتے ہیں، محض اس وجہ سے کہ وہ ایک ایرانی تھا۔ ایک معزز ایرانی۔ یہ ایرانی قوم کی توہین ہے۔"۔۔۔

فیروزان کا مقبرہ کاشان نے فنس جانے والی سڑک پر ہے۔ اسے گیارہویں صدی میں تعمیر کیا گیا اور اس کا آرکیٹیکچر ایرانی اور خوارزمی شاہی خاندانوں کے طرز تعمیر کا ہے۔ اس میں ایک صحن، ایک پورچ اور مخروطی گنبد ہے جس پر ہلکے نیلے رنگ کی ٹائلیں لگی ہیں اور اس کی چھت پر پینٹ کیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر کی اصل تاریخ نامعلوم ہے لیکن چودھویں صدی کے نصف آخر میں اسے بھرپور انداز میں بنایا گیا اور اس کی قبر کے اوپر ایک نیا پتھر نصب کیا گیا۔[2]

اہل سنت کا کہنا یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں اہل عجم نے کوفہ، بصرہ اور مصر کے لوگوں نے مل کر عبداللہ بن سبا کی قیادت میں فساد عظیم برپا کیا۔ ان کے نزدیک یہ ابن سبا ہی کا تیار کردہ گروہ تھا جس نے مدینہ میں شورش برپا کی اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ اس کے بعد ان کے ایک گروہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مان لیا اور دوسرے گروہ نے مکہ میں ایسا پروپیگنڈا کیا جس سے سیدنا طلحہ و زبیر اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہم کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہوئی۔ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان سے مل کر ان کی غلط فہمیاں دور کر دیں تو اسی سبائی گروہ نے رات میں دونوں جانب حملہ کر کے انہوں نے جنگ شروع کروا دی جس میں ہزاروں اہل ایمان شہید ہوئے۔ ان کا ایک گروہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاں یہی پروپیگنڈا کرتا رہا کہ سیدنا عثمان کو معاذ اللہ سیدنا علی رضی اللہ عنہما نے قتل کروا دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں جنگ صفین ہوئی۔ پھر ایک گروہ خوارج کے نام سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے الگ ہو گیا اور آپ کے خلاف بغاوت کرتا رہا۔ اہل تشیع اس الزام کو مسترد کرتے ہیں اور بالعموم ابن سبا کو ایک فرضی شخصیت قرار دیتے ہیں۔

اہل سنت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی بہت تعریف کرتے ہیں جنہوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے انہیں خلیفہ تسلیم کر لیا اور اس طرح امت کو افتراق و انتشار سے بچا لیا۔ البتہ آپ کے دور میں عجم کی یہ سازش اندر ہی اندر پنپتی رہی۔ اہل سنت کا خیال ہے کہ جب آپ کی وفات کے بعد آپ کا بیٹا یزید حکمران بنا تو انہی سازشیوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ بلوایا اور پھر خود ہی شہید کروا دیا۔

اہل سنت عام طور پر یزید اور اس کے بعد کے حکمرانوں کی مذمت کرتے ہیں البتہ ان کے ایک گروہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حقائق اس طرح نہیں ہیں جیسا کہ تاریخ کی کتب میں عام طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ غلط روایات گھڑ کر ان میں یزید کی خاص طور پر کردار کشی کی گئی ہے، ورنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت جن میں حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسی شخصیات شامل تھیں، نے یزید کی بیعت کر لی تھی۔ اہل سنت کی اکثریت تاہم اس نقطہ نظر کو تسلیم نہیں کرتی ہے۔

اہل سنت کا کہنا یہ ہے کہ واقعہ کربلا ایک حادثہ تھا۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کے خلاف کوئی بغاوت نہ کی تھی۔ آپ کو اہل عراق نے خطوط لکھ کر وہاں آنے اور اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی تھی۔ آپ نے ان کی تصدیق کے لیے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کو کوفہ بھیجا جن سے آپ کو یہ اطلاعات ملی تھیں کہ عراق میں حکومت کا کنٹرول کمزور ہونے سے انارکی کی سی صورت ہے اور یہ لوگ آپ کی بیعت کے لیے تیار ہیں۔ آپ ایک انارکی زدہ صوبے میں حکومت قائم کرنے تشریف لے جا رہے تھے کہ حالات تبدیل ہو گئے اور یزید کا اقتدار وہاں قائم ہو گیا۔ اس کے بعد وہاں کے گورنر عبید اللہ بن زیاد نے مسلم بن عقیل کو قتل کر دیا اور ایک لشکر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تا کہ آپ کو بیعت کے لیے مجبور کیا جائے۔ آپ بیعت کے لیے تیار ہو بھی گئے لیکن مسلم بن عقیل کے بھائیوں اور اولاد نے جوش میں آ کر اس لشکر پر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں جنگ ہوئی اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی شہید ہو گئے۔ یزید کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو اسے سخت افسوس ہوا اور اس نے آپ کے خانوادے کی خواتین اور حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کی دلجوئی کی۔ بعض سنی کہتے ہیں کہ یزیدی فوجوں نے نہیں بلکہ خود اہل کوفہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ تاہم اہل سنت کی اکثریت یزید ہی کو سانحہ کربلا اور بعد کے واقعات کا ذمہ دار سمجھتی ہے۔

قدیم اہل سنت عام طور پر بنو امیہ کے ابتدائی حکمرانوں جن میں مروان اور ان کے بیٹے عبد الملک بن مروان شامل ہیں، کا احترام کرتے تھے۔ مثال کے طور پر امام مالک نے اپنی کتاب موطا میں ان کے فتاوی اور عدالتی فیصلے نقل کیے ہیں۔ بعد کے دور کے اہل سنت ان حکمرانوں کی بھی بالعموم مذمت کرتے ہیں۔ بنو امیہ کے خلاف اہل بیت کے بزرگوں جیسے زید بن علی (75-122/695-740) اور نفس زکیہ (d. 144/762) کی جانب سے جو بغاوتیں ہوئیں، ان کے بارے میں اہل سنت کے ہاں بالعموم ہمدردی پائی جاتی ہے۔

بعد کے ادوار کی تاریخ میں اہل سنت یہ محسوس کرتے ہیں کہ اہل تشیع نے بنو عباس کے ساتھ مل کر بنو امیہ کا تختہ الٹا۔ اس کے بعد ان کے خاندان جیسے آل بویہ عملاً حکومت کرنے لگے۔ اہل سنت یہ الزام بھی عائد کرتے ہیں ایران کے صفوی خاندان کے دور حکومت میں اہل سنت پر زمین تنگ کی گئی اور انہیں زبردستی شیعہ ہونے پر مجبور کیا گیا۔ اہل تشیع اس بات کو مسترد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سنی حکمران تھے جو شیعوں پر ظلم و ستم کرتے رہے، جس کی وجہ سے انہیں تقیہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

خوارج کا نقطہ نظر

خوارج کا نقطہ نظر اہل سنت اور اہل تشیع دونوں ہی سے مختلف ہے۔ یہ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں ہی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ "لا حکم الا اللہ" یعنی اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چل سکتا۔ چونکہ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما نے واقعہ تحکیم میں جج مقرر کیے، اس وجہ سے معاذ اللہ وہ دونوں کافر ہو گئے۔ پھر جو شخص انہیں کافر نہ مانے، وہ بھی کافر۔ چنانچہ یہ تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر ان کے قتل کو جائز سمجھتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف جو فوجی کاروائی کی، اسے یہ اپنے پر ظلم سمجھتے تھے اور بعد کے ادوار میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور بنو امیہ کے دیگر حکمرانوں نے ان کے خلاف جو کاروائیاں

کی، ان کو بھی خود پر ظلم سمجھتے ہیں۔ خوارج کا یہ گروہ پے در پے جنگوں کی وجہ سے ختم ہو گیا تاہم ان میں سے ایک اعتدال پسند گروہ الگ ہو گیا جو "اباضیہ" کہلاتے ہیں۔ ان کے نظریات کا تفصیلی مطالعہ ہم اگلے اسباق میں کریں گے۔

تاریخی روایات کی جانچ پڑتال

ایک غیر جانبدار طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل تشیع اور اہل سنت دونوں کے سازشی نظریات میں سے کون سا نظریہ درست ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ دونوں گروہ ہی اپنے اپنے نقطہ نظر کے حق میں تاریخی روایات کو پیش کرتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے تاریخی روایات کے ذخیرے کی نوعیت کا جائزہ لے لیا جائے۔

یہ بات معلوم و معروف ہے کہ عہد صحابہ میں لکھنے کا زیادہ رواج نہ تھا۔ صرف قرآن ہی ایسی کتاب تھی جو باقاعدہ لکھی ہوئی تھی۔ ہر طرح کے علوم جن میں حدیث، تفسیر، فقہی آراء اور فتاوی، عدالتی فیصلے، خطبات، اشعار وغیرہ کے جو عالم ہوا کرتے تھے، وہ اس پورے مجموعے کو اپنے حافظے میں محفوظ رکھتے اور اپنے شاگردوں کی محفلوں میں اسے بیان کرتے، جسے سن کر وہ لوگ یاد کر لیا کرتے تھے۔ عربوں کا حافظہ غیر معمولی تھا اور سینکڑوں اشعار پر مشتمل قصیدے انہیں زبانی یاد ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض لوگ اگر کچھ لکھ لیتے تھے تو اس کی حیثیت کتاب کی نہیں بلکہ ذاتی ڈائری کی ہوا کرتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عرب میں کاغذ چین سے امپورٹ کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے یہ خاصا مہنگا تھا۔

دوسری صدی ہجری میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ علم کا جو ذخیرہ علماء کے سینوں میں محفوظ ہے، اسے ضبط تحریر میں لایا جائے تا کہ یہ ضائع نہ ہو جائے۔ اسی زمانے میں عربوں نے چینیوں سے کاغذ بنانے کا طریقہ سیکھا تو ان کے ہاں کاغذ کی قلت دور ہو گئی۔ چنانچہ ہر ہر علم سے متعلق جو معلومات دستیاب تھیں، انہیں تحریر میں لایا جانے لگا۔ جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دینی احکام سے متعلق احادیث کا تعلق ہے، تو اس ضمن میں غیر معمولی احتیاط برتی گئی کیونکہ آپ سے جھوٹ منسوب کر دینے پر جہنم کی وعید سب کے علم میں تھی۔ نہ صرف احادیث بلکہ ان کے راویوں کے حالات کو بھی نوٹ کر لیا گیا تا کہ یہ جانچا جا سکے کہ کون سی حدیث کس حد تک قابل اعتماد ہے۔ احادیث کی صحت کو چیک کرنے کے مختلف طریقے وضع ہوئے جس سے بڑی حد تک یہ ممکن ہو گیا کہ صحیح و ضعیف حدیث میں فرق کیا جا سکے۔

باقی علوم جن میں تاریخ شامل ہے، میں یہ احتیاط نہ کی جا سکی۔ تیسری صدی ہجری میں علوم کی تدوین کا یہ عمل اپنے عروج کو پہنچا اور سابقہ نسلوں سے جو کچھ علم بھی دستیاب تھا، اسے نوٹ کر لیا گیا۔ اس زمانے میں ایک غیر معمولی شخصیت امام ابن جریر طبری (224-310/838-922) کی تھی۔ انہوں نے تفسیر اور تاریخ کے میدان کا انتخاب کیا اور اس ضمن میں پچھلی نسلوں سے انہیں جو کچھ ملا، اسے انہوں نے اپنی دو کتب میں سند کے ساتھ درج کر دیا۔ یہ کتب "تفسیر ابن جریر" اور "تاریخ طبری" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی یہی

دونوں کتب اپنے اپنے میدان میں "امہات" یعنی ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ طبری نے ان روایات کی بہت زیادہ چھان بین نہیں کی بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ جس حالت میں موجود ہے، اسے اسی حالت میں درج کر دیا جائے۔ اس کے بعد جو چاہے، وہ اس مواد پر تحقیق کر کے صحیح و ضعیف کو الگ الگ کر لے۔ ہاں بالکل ہی گئی گزری روایتوں کو انہوں نے نظر انداز کر دیا۔

اب ہوتا یہ ہے کہ اہل تشیع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف جو تاریخی روایات پیش کرتے ہیں، وہ اہل سنت کے نزدیک معتبر نہیں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ روایات نہایت ہی غالی قسم کے شیعہ حضرات نے اس لیے گھڑی ہیں تاکہ ان کی مدد سے صحابہ کرام پر تنقید کی جائے اور ان کی مدد سے اپنے مسلکی اور سیاسی مفادات حاصل کیے جائیں۔ شیعہ حضرات اس بات کی تردید کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ایسی کوئی روایات نہیں گھڑی ہیں۔ اسی طرح اہل سنت کی تاریخی روایات کو اہل تشیع تسلیم نہیں کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ائمہ اہل بیت کو اقتدار سے محروم رکھنے کے لیے یہ روایتیں گھڑی ہیں۔

ان تمام روایات کو اگر اس معیار پر پرکھا جائے جس پر حدیث کو پرکھا جاتا ہے تو ان کا نوے فیصد حصہ لائق اعتماد نہ رہے۔ محدثین کا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی روایت قبول نہیں کرتے جس کے بارے میں شبہ ہو کہ وہ اپنے نقطہ نظر کی تائید اور مخالف کے نقطہ نظر کی تردید میں جعلی روایات گھڑتا ہو۔ اس معاملے میں وہ مسلک کا خیال نہیں رکھتے۔ اگر مثلاً کوئی شیعہ اہل بیت کے فضائل میں احادیث گھڑتا ہے تو وہ اس کی روایت کو قبول نہیں کرتے اور اگر کوئی سنی، حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل میں احادیث ایجاد کرتا ہے تو محدثین اس کی دیگر روایات کو بھی قبول نہیں کرتے۔ ان محدثین نے فن رجال کے نام سے جو فن ایجاد کیا، اس میں راویوں کے تفصیلی حالات کو ممکنہ حد تک اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ ان معلومات کی روشنی میں ماہرین اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ کوئی شخص کس حد تک لائق اعتماد ہے۔ اس فن کو "جرح و تعدیل" کہا جاتا ہے۔

تاریخ طبری میں اگر ان روایات کا جائزہ لیا جائے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اختلافات سے متعلق ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر روایات پانچ افراد سے ملتی ہیں جن کے نام یہ ہیں: محمد بن عمر الواقدی، محمد بن سائب الکلبی، ہشام بن محمد بن سائب، محمد بن مروان السدی، ابو مخنف لوط بن یحیی اور محمد بن اسحاق سے۔ سوائے آخری صاحب کے باقی سب حضرات وہ ہیں جن کی عمومی شہرت یہ ہے کہ یہ لوگ جھوٹ گھڑتے ہیں۔ یہاں ہم کتب جرح و تعدیل سے ان کے بارے میں محدثین کی آراء نقل کر رہے ہیں۔

محمد بن اسحاق *(d. 151/768)*

یہ وہ صاحب ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ، اسلامی تاریخ اور جنگوں سے متعلق پہلی کتاب لکھی جو "المغازی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہی وہ کتاب ہے جو بعد کی تاریخی کتب کی بنیاد بنی۔ تاریخی روایات کا بڑا حصہ انہی سے مروی ہے۔ ان کے بارے میں محدثین اور ماہرین جرح و تعدیل کے مابین اختلاف ہے کہ یہ ثقہ تھے یا نہیں تھے۔ علی بن مدینی اور ابن شہاب زہری نے انہیں سب سے بڑا عالم قرار دیا ہے۔ سفیان بن عینیہ انہیں امیر المومنین فی الحدیث سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس امام مالک (93-

(179/711-795) جو ان کے ہم عصر تھے، انہیں "دجال" کا لقب دیتے ہیں۔ ان پر شیعہ اور فرقہ قدریہ سے ہونے کا الزام ہے اور اس کے علاوہ ان پر تدلیس (غیر ثقہ راوی کا نام چھپالینا تاکہ یہ لگے کہ حدیث مستند ہے) کے ارتکاب کا الزام بھی ہے۔ یحیی بن معین کہتے ہیں کہ ثقہ تو تھے مگر حجت نہیں تھے۔[3]

ابو مخنف لوط بن یحیی (d. 170/786)

یہ "اخباری" یعنی خبر روایت کرنے والے مشہور ہیں۔ واقعہ کربلا اور اس کے بعد کے واقعات کا زیادہ تر حصہ تاریخ طبری میں انہی سے مروی ہے۔ دارقطنی نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے، ابن معین کہتے ہیں کہ یہ کچھ نہیں ہیں، ابن عدی نے انہیں غالی شیعہ قرار دیا ہے۔[4]

محمد بن سائب الکلبی (d. c. 185/800)

محمد بن سائب الکلبی کے بارے میں مشہور امام سفیان ثوری کہتے ہیں: "کلبی سے بچو۔" کہا گیا: "آپ بھی تو ان سے روایت کرتے ہیں؟" کہا: "میں اس کے سچ اور جھوٹ کو پہچانتا ہوں۔" سفیان ثوری کہتے ہیں کہ کلبی نے مجھ سے کہا: "میں ابو صالح سے جتنی روایتیں بیان کرتا ہوں، وہ سب جھوٹ ہیں۔" اعمش کہا کرتے تھے: "اس سبائی سے بچو، میں نے دیکھا ہے کہ لوگ اس کا نام جھوٹوں میں لیتے ہیں۔" احمد بن زہیر کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے پوچھا: "کیا کلبی کی تفسیر کو دیکھنا جائز ہے؟" انہوں نے کہا: "نہیں۔" ابن معین کہتے ہیں: "کلبی ثقہ نہیں ہے۔"

جوزجانی نے کلبی کو "کذاب" اور دارقطنی نے متروک قرار دیا ہے۔ مشہور محدث ذہبی کہتے ہیں کہ اس کا کتاب میں ذکر کرنا درست نہیں ہے تو پھر اس سے روایت قبول کیسے کی جائے۔[5]

محمد بن مروان السدی (d. c. 190/805)

ابن معین کہتے ہیں کہ یہ ثقہ نہیں ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ ان کی روایتوں میں ضعف واضح ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کلبی کے ساتھی تھے۔[6]

ہشام بن محمد بن سائب الکلبی (d. 204/819)

یہ انہی کلبی صاحب کے بیٹے تھے اور اپنے والد سے روایات لیا کرتے تھے۔ دارقطنی نے انہیں متروک قرار دیا ہے۔ ابن عساکر انہیں ثقہ نہیں سمجھتے۔ 150 کتب کے مصنف تھے۔[7]

محمد بن عمر الواقدی (d. 207/822)

یہ صاحب بغداد کے قاضی تھے اور بڑے عالم تھے۔ ان کے بارے میں احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ یہ کذاب ہے۔ ابن معین انہیں ثقہ

نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ان کی حدیث کبھی نہ لکھو۔ بخاری اور ابو حاتم انہیں متروک قرار دیتے ہیں۔ ابن المدینی، ابو حاتم اور نسائی کہتے ہیں کہ یہ حدیث گھڑا کرتے تھے۔ دار قطنی کہتے ہیں کہ ان میں ضعف پایا جاتا ہے۔ ابن المدینی کہتے ہیں کہ یہ صاحب تیس ہزار ایسی احادیث سنایا کرتے تھے جو کہ بالکل ہی اجنبی تھیں۔ [8]

احمد بن حنبل، ابن معین، بخاری، ابو حاتم، ابن المدینی، ابو حاتم، نسائی اور دار قطنی سب کے سب تیسری صدی ہجری کے مشہور ائمہ جرح و تعدیل ہیں اور ان کی رائے فن جرح و تعدیل میں اتھارٹی کا درجہ رکھتی ہے۔

تاریخی روایات کی چھان بین کیسے کی جائے؟

حال ہی میں شام کے دو محققین محمد بن طاہر البرزنجی اور محمد صبحی حسن حلاق نے صحیح و ضعیف تاریخ الطبری کے عنوان سے اس کتاب کی صحیح و ضعیف روایات کی چھان بین کی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک فریق کے نزدیک یہ راوی قابل اعتماد اور دوسرے کے نزدیک ناقابل اعتماد ہوں مگر جہاں شک پیدا ہو جائے، وہاں حتمی فیصلہ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ چونکہ یہ تاریخی معلومات ہم تک ایسے ذرائع سے نہیں پہنچ سکیں جو اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کے نزدیک قابل اعتماد ہوں، اس وجہ سے ایک غیر جانبدار محقق کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچ سکے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کیا جائے۔ اس ضمن میں ایک مثال پر غور کیجیے۔

فرض کیجیے کہ آپ کسی عدالت کے ایک دیانت دار اور غیر جانب دار جج ہیں۔ آپ کے پاس ایسا مقدمہ لایا گیا ہے جس میں پچاس برس پہلے کے کسی قتل کی تحقیق کر کے آپ کو کسی ملزم پر فرد جرم عائد کرنا ہے۔ اس قتل کے جو ممکنہ گواہ ہو سکتے تھے، وہ سب کے سب فوت ہو چکے ہیں۔ قتل کے بارے میں فنگر پرنٹس وغیرہ کی صورت میں جو شواہد تھے، وہ ضائع ہو چکے ہیں۔ بس جو کچھ باقی ہے، وہ چند لوگوں کے ریکارڈ شدہ بیانات ہیں جو کہ عدالتی ریکارڈ میں موجود نہیں ہیں بلکہ ان بیانات کو کسی نے متعلقہ گواہوں سے سنا تھا اور اب وہ انہیں بیان کر رہا ہے۔ جو شخص یہ دعوی کر رہا ہے کہ اس نے ان بیانات کو متعلقہ گواہوں سے سنا ہے، اس کا اپنا کیریکٹر بھی مشکوک ہے۔ کیا آپ ان ثبوتوں کی روشنی میں فیصلہ سنا کر کسی پر فرد جرم عائد کر سکتے ہیں؟ اگر گواہوں اور ثبوت کی عدم موجودگی میں جب پچاس برس پہلے کے کسی قضیہ کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تو پھر چودہ سو برس پہلے کے واقعات کا فیصلہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

اہل سنت کا کہنا یہ ہے کہ صحابہ کرام، امہات المومنین اور اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم کے جو اجمالی فضائل قرآن مجید میں موجود ہیں، ان کو مد نظر رکھا جائے تو تاریخی روایات کو اس کی روشنی میں با آسانی پرکھا جا سکتا ہے۔ انہی روایتوں کے اندر ایسی بہت سی روایتیں بھی موجود ہیں جن میں صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم کے باہمی تعلقات اور رشتے داریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مابین نہایت ہی احترام پر مبنی تعلقات تھے۔ اگر روایتوں ہی کو قبول کرنا ہے تو پھر ایسی روایتوں کو قبول کیوں نہ کیا جائے؟ مشہور سنی عالم سید ابو الاعلی مودودی (1903-1979) لکھتے ہیں:

اس تاریخ میں ہمارے سامنے کچھ اس طرح کا نقشہ آتا ہے کہ ایک حوصلہ مند شخص نے کئی سال کی جانفشانی سے، لڑ بھڑ کر ایک ملک فتح کیا تھا اور اپنے زور بازو سے ایک سلطنت قائم کر لی تھی۔ پھر قضائے الٰہی سے اس نے وفات پائی۔ اس کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے رفیقوں اور ساتھیوں نے، جو سب کے سب اسی کے بنائے ہوئے آدمی تھے، اور جن پر وہ تمام عمر اعتماد کرتا رہا، یکایک آنکھیں پھیر لیں۔ ابھی اس کے گھر والے اس کی تجہیز و تکفین ہی میں مشغول تھے کہ اس کے ساتھیوں کو یہ فکر پڑ گئی کہ کسی طرح تخت شاہی پر قبضہ کر لیں۔ چنانچہ وہ جمع ہوئے اور پہلے آپس میں جھگڑا کرتے رہے۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ یہ لقمہ تر میرے منہ میں آئے۔ آخر بڑی ردو کد کے بعد انہوں نے اپنے میں سے ایک کو بادشاہی کے لیے منتخب کر لیا۔ یہ کاروائی جب مکمل ہو گئی تو بانی سلطنت کے خاندان والوں کو اس کی خبر پہنچی اور ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مرحوم کا بیٹا تو تھا نہیں، ایک داماد تھا۔ وہ بپھر گیا کہ میرے ہوتے اور کون وارث تاج و تخت ہو سکتا ہے، بیٹی بھی پیچ و تاب کھانے لگی کہ جو سلطنت اسی کے باپ نے برسوں کی جانفشانی سے قائم کی تھی، اس پر دوسروں کو قبضہ کر لینے کا کیا حق ہے۔ پہلے تو خاندان والے آپس میں سر جوڑ کر مشورے کرتے رہے۔ پھر انہوں نے مرحوم بادشاہ کے پرانے پرانے ساتھیوں کو اس کے احسانات یاد دلا دلا کر اپیل کرنے شروع کیے، اور پبلک میں اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ مرحوم کا داماد اس کی بیٹی کو دارالسلطنت کے محلوں میں لیے پھرتا رہا اور ایک ایک بااثر قبیلے میں اسے لے گیا تاکہ شاید اسی کی فریاد سے لوگوں کے دل پگھل جائیں۔ مرحوم بادشاہ کی قبر کو بھی خطاب کر کے دہائیاں دیں کہ شاید یہی اپیل کارگر ہو جائے، مگر کسی نے سن کر نہ دی۔ آخر بیچارہ تھک ہار کر بیٹھ رہا، اور جب مرحوم کی بیٹی بھی، جو اس کے دعوے کی اصل بنیاد تھی، دنیا سے رخصت ہو گئی، تو اس غریب نے جا کر بادل نخواستہ غاصب تخت کی اطاعت قبول کر لی۔ مگر دل میں وہ برابر پیچ و تاب کھاتا رہا اور وقتاً فوقتاً اپنے اس پیچ و تاب کا اظہار بھی کسی نہ کسی طرح کرتا رہا۔

کیا واقعی یہی تصویر ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل بیت اور ان کے اصحاب کبار کی؟ کیا اللہ کے رسول کی یہی پوزیشن تھی کہ وہ دنیا کے عام بانیان سلطنت کی طرح ایک سلطنت کا بانی تھا؟ کیا پیغمبر خدا کی 23 سالہ تعلیم، صحبت اور تربیت سے یہی اخلاق، یہی سیرتیں اور یہی کردار تیار ہوتے تھے؟ آخر اس نقشے کی کیا مناسبت ہے قرآن اور اس کی پاکیزہ تعلیمات سے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے اور آپ کی ان بلند ترین اخلاقی ہدایات سے جو ذخیرہ حدیث میں بھری پڑی ہیں؟ حضرت علی اور حضرت فاطمہ [رضی اللہ عنہما] کے ان سوانح حیات سے جن میں (اس ایک قصہ کے سوا) دنیا طلبی کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا؟ ابو بکر و عمر [رضی اللہ عنہما] کی ان زندگیوں سے جن کا کوئی رنگ بھی دنیا کے بھوکے لوگوں کے رنگ ڈھنگ سے نہیں ملتا؟ اور صحابہ کرام کی ان سیرتوں سے جن کے مجموعے میں اس داستان کے کھینچے ہوئے نقشے کو رکھ کر دیکھا جائے تو کسی طرف سے بھی اس کا جوڑ ان کے ساتھ بیٹھتا نظر نہیں آتا؟

پھر اگر اس گروہ کی تاریخ کا پورا مستند ذخیرہ ہمارے سامنے اس کے اخلاق، اس کی سیرت، اس کی ذہنیت اور اس کے نفسیات کا کچھ اور نقشہ پیش کرتا ہے اور صرف یہ ایک مجموعہ روایات اس کے بالکل برعکس ایک اور ہی نقشہ پیش کر رہا ہے تو آخر عقل کیا کہتی ہے؟ کیا یہ کہ سمندر میں اتفاقاً آگ لگ گئی تھی؟ یا یہ کہ سمندر میں پانی تھا ہی نہیں، آگ ہی آگ تھی؟ یا یہ کہ آگ لگنے کا قصہ جھوٹا ہے، جب تمام شہادتیں اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ وہ سمندر تھا تو وہاں پانی کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا!

تاہم اگر کسی کا جی چاہتا ہے کہ اس قصے کو باور کرے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔ تاریخ کے صفحات تو بہر حال اس سے آلودہ ہی ہیں۔ مگر پھر ساتھ ہی یہ ماننا پڑے گا کہ خاکم بدہن رسالت کا دعوی محض ایک ڈھونگ تھا، قرآن شاعرانہ لفاظی کے سوا کچھ نہ تھا، اور تقدس کی ساری داستانیں خالص ریاکاری کی داستانیں تھیں۔ اصل میں تو ایک شخص نے ان چالوں سے دنیا کو پھانسا تھا تاکہ اپنی ایک سلطنت بنائے اور اس قسم کے دنیا طلب مکاروں کے گرد جیسے لوگ جمع ہوا کرتے ہیں، ویسے ہی لوگ اس کے گرد بھی جمع ہو گئے تھے اور تقدس کے اس ظاہری پردے میں

دراصل وہ جن مقاصد کے لیے کام کر رہا تھا، ان کا راز آخر کار اس کے اپنے گھر والوں نے فاش کر کے رکھ دیا۔ معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ۔

اس کے مقابلہ میں تاریخ کچھ اور روایات بھی پیش کرتی ہے۔ ذرا ان کو بھی دیکھ لیجیے۔ علامہ ابو جعفر ابن جریر طبری پوری سند کے ساتھ یہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت سعید بن زید (رضی اللہ عنہ) سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعات پوچھے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بیان کیا۔۔۔

علی بن ابی طالب اپنے گھر میں تھے کہ ایک شخص نے ان کو جا کر خبر دی کہ ابو بکر بیعت لینے کے لیے بیٹھے ہیں۔ یہ سن کر وہ چادر اور ازار کے بغیر نرے قمیص ہی میں نکل کھڑے ہوئے۔ اتنی دیر کرنی بھی انہوں نے پسند نہ کی کہ کپڑے پہن لیں۔ پہلے جا کر بیعت کی، پھر گھر سے کپڑے منگائے اور پہن کر مجلس میں بیٹھے۔

بیہقی کی روایت اس سے تھوڑی مختلف ہے۔ وہ ابو سعید خدری سے روایت کرتے ہیں کہ۔۔۔ پھر ابو بکر منبر پر چڑھے اور حاضرین مجلس پر نظر ڈالی۔ دیکھا کہ زبیر موجود نہیں ہیں۔ ان کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا۔ جب وہ آئے تو فرمایا: میں کہہ رہا تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی اور حضور کے حواری کہاں ہیں؟ کیا تم مسلمانوں کی جماعت سے الگ رہنا چاہتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا: اے جانشین رسول صلی اللہ علیہ وسلم! معاف فرمایئے، پھر اٹھے اور بیعت کی۔ پھر ابو بکر نے مجمع پر دوبارہ نظر ڈالی اور دیکھا کہ علی نہیں ہیں۔ انہیں بلانے کے لیے بھی آدمی بھیجا۔ جب وہ آگئے تو فرمایا، میں کہہ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور داماد کہاں رہ گئے۔ کیا تم مسلمانوں کی جماعت سے الگ رہنا چاہتے تھے؟ انہوں نے بھی فرمایا کہ اے جانشین رسول صلی اللہ علیہ وسلم! معاف فرمایئے۔ پھر بیعت کی۔۔۔

ہم خواہ مخواہ کسی کے ساتھ بحث و مناظرے میں نہیں الجھنا چاہتے۔ ہم نے یہ دونوں تصویریں پیش کر دی ہیں۔ اب ہر صاحب عقل کو خود سوچنا چاہیے کہ ان میں سے کون سی تصویر مبلغ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت و اصحاب کبار کی سیر توں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اگر پہلی تصویر پر کسی کا دل رجھتا ہے تو رجھے، مگر اس کے ساتھ ایک امیدواری اور دعویداری کا مسئلہ ہی نہیں، پورے دین و ایمان کا مسئلہ حل طلب ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی اس دوسری تصویر کو قبول کرے تو اس میں سرے سے اس واقعہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے کہ حضرت علی منصب خلافت کے امیدوار یا دعوے دار تھے۔ [9]

مودودی صاحب نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے متعلق جو دلائل پیش کیے ہیں، ان کا اطلاق حضرت عثمان، علی اور معاویہ رضی اللہ عنہم کے معاملے پر بھی ہوتا ہے۔ اسی استدلال کو نواب محسن الملک سید مہدی علی بن سید ضامن علی حسینی (1837-1905)، جو کہ پہلے اہل تشیع سے تعلق رکھتے تھے، نے پیش کیا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ جو اعتقاد شیعوں کا بہ نسبت صحابہ کے ہے، اس سے الزام آپ کی نبوت پر آتا ہے، اور سننے والے مذہب اسلام پر شبہ ہوتا ہے، اس لیے کہ جب کوئی اس امر پر یقین کر لے جو لوگ حضرت [صلی اللہ علیہ وسلم] پر ایمان لائے، ان کے دلوں پر کچھ اثر ایمان و اسلام کا نہ تھا اور وہ ظاہر میں مسلمان اور عیاذاً باللہ باطن میں کافر تھے، یہ حضرت کے انتقال کرتے ہی وہ اس سے پھر گئے، وہ حضرت کی نبوت کی تصدیق کر نہیں سکتا، اور کہہ سکتا ہے کہ حضرت اگر سچے نبی ہوتے تو کچھ نہ کچھ ان کی ہدایت میں تاثیر ہوتی اور کوئی نہ کوئی دل سے ان پر ایمان لایا ہوتا، اور منجملہ ہزاروں، لاکھوں آدمیوں کے جو ان پر ایمان لائے، سو دو سو آدمی تو ایمان پر ثابت قدم رہتے۔ اگر صحابہ کرام تمہارے عقائد باطلہ کے موافق

اسلام اور ایمان میں کامل نہ تھے، تو وہ لوگ کون سے ہیں، جن پر حضرت کی ہدایت کا اثر ہوا، اور ویسے لوگ کتنے ہیں؟ جن کو حضرت کو نبوت سے فائدہ ہوا، اگر اصحاب نبی سوائے معدودے چند کے بقول تمہارے سب کے سب عیاذاً باللہ منافق اور مرتد تھے تو دین اسلام کو کس نے قبول کیا؟ اور پیغمبر صاحب کی تعلیم و تلقین سے کس کو نفع پہونچا۔"[10]

بعض حضرات نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ تاریخی روایات کا بڑا حصہ انہی پانچ بلکہ ان میں سے دو حضرات، واقدی اور محمد بن اسحاق کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ اب اگر ہم ان کی منفی روایتوں کو چھوڑ کر صرف مثبت روایتیں لیں گے تو کیا یہ دوغلا پن نہیں ہو گا؟ کیا پھر ہم "میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو" والے رویے کو اختیار کرنے والے نہ ہوں گے؟ اگر ہم ان کی روایتوں کو چھوڑتے ہیں تو پھر تو ہمیں تاریخ اسلامی کے 90% حصے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

اس کے جواب میں اہل سنت کہتے ہیں کہ ایسی عام تاریخی معلومات جن میں کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ نہ ہو کو کسی بھی قابل اعتماد یا ناقابل اعتماد راوی کی بیان کردہ معلومات کی روشنی میں قبول کیا جا سکتا ہے۔ جیسے کوئی واقعہ کب پیش آیا؟ کوئی جنگ کہاں ہوئی؟ کسی جنگ میں امیر لشکر نے کیا حکمت عملی اختیار کی؟ کسی سفر میں کسی خلیفہ نے کہاں پڑاؤ ڈالا؟ روزمرہ زندگی کے کسی مسئلے میں کسی خلیفہ نے کیا فیصلہ کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ اگر واقدی یا محمد بن اسحاق کی بیان کردہ ایسی معلومات کو قبول بھی کر لیا جائے اور بالفرض یہ غلط بھی ہوں گی تو اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑے گا۔ اس کے برعکس، متنازعہ معاملات میں ان کی بیان کردہ باتوں، خواہ وہ اہل سنت کے حق میں ہوں یا اہل تشیع کے، کو اس وجہ سے قبول نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اور معلومات کے اور ذرائع دستیاب نہیں ہیں۔

وہ ایک مثال کے ذریعے وضاحت کرتے ہیں کہ اپنی عملی زندگی میں بھی ہم اسی طریقے پر عمل کرتے ہیں۔ زندگی کے چھوٹے موٹے امور جیسے دس بیس روپے کی کوئی چیز خریدنا ہو تو ہمیں جس شخص سے جو معلومات ملیں، ہم قبول کر کے اپنے فیصلے کر لیتے ہیں۔ پھر اگر وہ معلومات غلط بھی نکلیں تو اپنا چھوٹا موٹا نقصان بھی ہم برداشت کر لیتے ہیں اور آئندہ کے لیے محتاط ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر بڑے فیصلے کرنا ہوں، جیسے بیٹی کی شادی کرنا ہو یا کروڑوں روپے کی کوئی چیز خریدنا ہو تو پھر ہم بہت احتیاط کرتے ہیں اور ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کی بات پر اعتبار نہیں کرتے۔ وہاں ہم یہ عذر پیش نہیں کرتے کہ چونکہ معلومات صرف ایک ہی ذریعہ سے دستیاب ہیں، تو اگرچہ وہ قابل اعتماد نہیں ہے، اس وجہ سے اس کی دی ہوئی معلومات کو قبول کر لیا جائے۔ اس کے برعکس ہم درست معلومات تک رسائی کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور اگر معلومات نہ ملیں تو اپنے فیصلوں کو موخر کر دیتے ہیں۔ یہی اصول تاریخی معلومات کے لیے بھی اسی طرح قابل عمل ہے۔

فرض کیجیے کہ کوئی ایسا شخص، جس کا اپنا کیریکٹر مشکوک ہو، ہمیں آ کر یہ بتلائے کہ ہمارے دادا نے آج سے پچاس برس پہلے اسے سو روپے دے کر اس کی مدد کی تھی۔ ہمیں معلوم ہو کہ ہمارے دادا نیک آدمی تھے اور ہر ضرورت مند کی مدد کرتے تھے۔ کیا اس بات پر یقین کرنے میں ہمیں کوئی تردد ہو گا؟ اس کے برعکس اگر وہ آ کر یہ کہے کہ جناب آپ کے دادا رشوت لیتے تھے، یا انہوں نے کسی

طوائف سے ناجائز تعلقات قائم کیے تھے، یاوہ خود کسی طوائف کی اولاد تھے۔ کیااس شخص کی بات پر ہم فوراًایمان لے آئیں گے؟اول تو ہم فوراًہی اس کی بات کی تردید کریں گے۔ اگر وہ اپنے دعوی کے حق میں کوئی ثبوت پیش کرے گا تو اس کی ہر ممکن جانچ پڑتال کی کوشش کریں گے اور جب تک آخری درجے میں ٹھوس ثبوت نہ ملیں گے، اس وقت تک اس کی بات کا اعتبار نہ کریں گے۔ جب اپنے دادا کے بارے میں ہم اتنے محتاط ہیں تو پھر اصحاب رسول کے بارے میں اتنی بے احتیاطی کیوں کی جاتی ہے اور ان کی کردار کشی کرنے والے ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کی بات کیوں قبول کی جاتی ہے؟

اسائن منٹس

1. اہل سنت اور اہل تشیع کے نظریہ ہائے سازش کا موازنہ کیجیے۔
2. حضرت علی اور حضرت معاویہ، سیدہ عائشہ اور حضرت علی، سیدنا حسین اور یزید، وغیر ھم کے اختلافات کے بارے میں ہمیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟

---

[1] علی حسین رضوی، تاریخ شیعان علی۔ ص58

[2] The Circle of Ancient Iranian Studies (CAIS), http://www.cais-soas.com/News/2007/June2007/28-06.htm, accessed 12 Sep 2011

[3] تفصیلات کے لیے دیکھیے، تہذیب الکمال، راوی نمبر 5057

[4] دیکھیے میزان الاعتدال، راوی نمبر 6998

[5] دیکھیے میزان الاعتدال، راوی نمبر 7580

[6] دیکھیے میزان الاعتدال، راوی نمبر 8160

[7] دیکھیے میزان الاعتدال، راوی نمبر 9245

[8] یہ تفصیلات فن رجال کے مشہور ماہر حافظ ذہبی کی کتاب میزان الاعتدال سے لی گئی ہیں۔ راوی نمبر 7999

[9] رسائل و مسائل، جلد اول

[10] آیات بینات، حصہ اول بحوالہ متضاد تصویریں از ابوالحسن علی ندوی

سبق 6: متعہ

متعہ ایک ایسا عملی مسئلہ ہے جس کے بارے میں اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین شدید اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اہل تشیع کے نزدیک یہ بڑی فضیلت کا عمل ہے جبکہ اہل سنت اسے سخت برا سمجھتے ہیں۔ متعہ کا لفظی معنی ہے "فائدہ اٹھانا"۔ شریعت کی اصطلاح میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حج کے سفر میں عمرہ کا اضافی فائدہ اٹھانے کو فقہی اصطلاح میں "حج تمتع" کہا جاتا ہے۔ اصطلاحی مفہوم میں متعہ میعادی نکاح کو کہتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کسی خاتون سے اس شرط پر نکاح کرتا ہے کہ ایک طے شدہ مدت گزرنے پر ان کا نکاح ختم ہو جائے گا اور طلاق خود بخود واقع ہو جائے گی۔ یہ مدت ایک سال بھی ہو سکتی ہے اور ایک گھنٹہ بھی۔ متعہ میں ایک طے شدہ رقم بطور حق مہر مرد خاتون کو ادا کرتا ہے۔

اہل تشیع کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ معاہدہ بھی عام نکاح ہی کی ایک قسم ہے اور نہ صرف یہ کہ بالکل جائز ہے بلکہ ایک لائق تحسین عمل ہے کہ اس کی بدولت انسان بدکاری سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ ان کے مطابق متعہ کی شرائط میں یہ بات شامل ہے کہ مرد اور عورت متعین مدت کے لیے باقاعدہ نکاح کرتے ہوئے ایجاب و قبول کریں۔ بعض فقہاء کے نزدیک اس میں گواہوں کا ہونا ضروری ہے جبکہ بعض کا خیال یہ ہے کہ گواہوں کی شرط ضروری نہیں ہے۔ ان مرد و زن میں متعہ بھی حرام ہے، جن کے ساتھ عام نکاح حرام ہے۔ متعہ کے لیے ضروری ہے کہ مرد حق مہر کے طور پر کچھ رقم خاتون کو ادا کرے۔

اس کے برعکس اہل سنت متعہ کو حرام سمجھتے ہیں اور اس کی سختی سے مذمت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ عملاً متعہ اور بدکاری میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں گروہ اپنی اپنی کتب احادیث سے اس ضمن میں دلائل پیش کرتے ہیں، جن کا جائزہ لینے کا فائدہ اس لیے نہیں ہے کہ یہ کتب دونوں گروہوں کے مابین متفقہ نہیں ہیں۔ ہاں ہم ان احادیث کا جائزہ ضرور لیں گے جو ہر گروہ دوسرے کی کتب سے پیش کرتا ہے۔

متعہ کے جواز اور عدم جواز کے دلائل

پہلی دلیل: قرآن سے استدلال

متعہ کے جواز میں اہل تشیع قرآن مجید کی اس آیت کو پیش کرتے ہیں:

وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً وَلا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيماً حَكِيماً. (النساء4:24)

اہل سنت اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

"(جن خواتین سے نکاح کی حرمت کو بیان کر دیا گیا ہے) ان کے علاوہ جتنی خواتین ہیں، وہ تمہارے لیے حلال کر دی گئی ہیں اگر تم اپنے مال (کو بطور مہر و نفقہ انہیں ادا کر کے) انہیں حاصل کرنا چاہو، بشر طیکہ حصار نکاح میں انہیں محفوظ کرو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔ تو پھر ان سے ازدواجی زندگی کا جو لطف تم اٹھاؤ، اس کے بدلے، مہر کو بطور فرض انہیں ادا کرو۔ البتہ مہر مقرر کرنے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمہارے مابین کچھ سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اللہ علیم اور دانا ہے۔"

اس آیت کا ترجمہ اہل تشیع کے نزدیک یہ ہے:

"ان [مذکورہ] عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں تم پر حلال ہیں اور جنہیں اپنے مال کے ذریعے اپناؤ بشر طیکہ تم پاک دامن رہو اور زنا سے بچو۔ اور جن عورتوں سے متعہ کرو تو ان کا حق مہر جو تم پر واجب ہے، ادا کرو اور تم پر اس کی نسبت کوئی گناہ نہیں جس پر ایک دوسرے کے ساتھ مہر مقرر کر کے موافقت کر لو۔ خدا دانا و حکیم ہے۔"[1]

اس آیت میں جو الفاظ سرخ خط کشیدہ حروف میں دیے گئے ہیں، ان کے ترجمہ میں اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین اختلاف رائے ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں مکارم شیرازی صاحب لکھتے ہیں:

آیت کے اس حصے میں وقتی شادی کی طرف اشارہ ہے جسے اصطلاح میں "متعہ" کہتے ہیں۔ ارشاد رب العزت ہے: تم جن عورتوں کے ساتھ متعہ کرتے ہو، ان کا حق مہر ایک حق واجب کے طور پر ادا کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازدواج موقت کی اصل تشریع اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہی مسلمانوں میں تسلیم شدہ تھی۔ اس لیے تو خداوند عالم اس آیت میں حق مہر ادا کرنے کی وصیت فرما رہا ہے اور کیونکہ یہ ایک اہم تفسیری، فقہی اور اجتماعی بحث ہے، اس لیے ضروری ہے کہ کئی گوشوں اور پہلوؤں سے اس کا مطالعہ کیا جائے۔

1۔ جو قرائن آیت مندرجہ بالا میں موجود ہیں، وہ اس آیت کے وقتی شادی پر دلالت کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔

2۔ اس قسم کی شادیاں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوتی تھی اور رسول اللہ کے دور میں اسے منسوخ نہیں کیا گیا۔

3۔ اس قسم کی ازدواج معاشرتی اور اجتماعی ضرورت بھی ہیں۔

4۔ متعہ بہت سے مسائل کا حل بھی ہے۔

اب پہلی جہت کو لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ لفظ متعہ جس سے استمتعم لیا گیا ہے۔ اسلام میں وقتی نکاح کے لئے ہے اور اصطلاح کے مطابق اس بارے میں حقیقت شرعیہ موجود ہے۔ اس امر کا گواہ یہ ہے کہ متعہ کا لفظ اسی معنی میں احادیث پیغمبر اور کلمات صحابہ میں بارہا استعمال ہوا ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر اس لفظ کے مذکورہ معنی نہ لیے جائیں تو پھر اس کے لغوی معنی (نفع اٹھانا) مراد لیے جائیں گے تو اس صورت میں آیت کے معنی کا خلاصہ یہ ہو گا کہ اگر عقد دائمی والی عورتوں سے فائدہ اٹھاؤ تو ان کا حق مہر انہیں ادا کرو۔ جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ حق مہر کی ادائیگی کی شرط عورتوں سے تمتع یا نفع حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ تمام مہر بنابر مشہور یا کم از کم نصف حق مہر نکاح ہوتے ہی واجب ہو جاتا ہے۔

نیز یہ کہ بزرگ اصحاب اور تابعین مثلاً عبداللہ بن عباس اسلام کے مشہور عالم و مفسر، ابی بن کعب، جابر بن عبداللہ، عمران بن حصین، سعید بن جبیر، مجاہد، قتادہ، سدی اور دیگر بہت سے مفسرین اہل سنت اور تمام مفسرین اہل بیت مندرجہ بالا آیت سے نکاح موقت کے معنی سمجھے ہیں۔

جیسا کہ شیرازی صاحب نے بیان کیا کہ اہل تشیع اور اہل سنت کے مابین الفاظ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ کے معنی میں اختلاف ہے۔ اہل تشیع کے نزدیک اس کا معنی ہے کہ "ان میں سے جن عورتوں سے تم متعہ کرو" جبکہ اہل سنت کے نزدیک اس کا مطلب ہے کہ "ان میں سے جن خواتین سے تم ازدواجی زندگی کا لطف اٹھاؤ"۔ اہل سنت اس آیت کو لفظی مفہوم میں لیتے ہیں۔ چونکہ متعہ یا استمتاع کا مطلب ہے "فائدہ اٹھانا"، اس وجہ سے ان کے نزدیک یہاں ازدواجی زندگی کا فائدہ اٹھانا مراد ہے۔ اہل سنت کی دلیل یہ ہے کہ آیت میں مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ کے الفاظ "پاک دامن رہتے ہوئے نہ کہ آزادانہ شہوت رانی اختیار کرتے ہوئے" اس جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ یہاں لفظی معنی مراد ہے نہ کہ متعہ بحیثیت ایک اصطلاح۔ اگر کوئی شخص ایک خاتون سے متعہ کرے، پھر اس سے حاجت پوری ہونے کے بعد دوسری کے ساتھ رہنا شروع کر دے، پھر تیسری کی جانب چلا جائے تو اس شخص پر مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ (یعنی پاک دامن رہتے ہوئے نہ کہ آزادانہ شہوت رانی اختیار کرتے ہوئے) کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

اہل سنت مزید کہتے ہیں کہ اپنے نتائج کے اعتبار سے متعہ اور بدکاری میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نکاح کا مقصد ہی یہ ہے کہ ایک مرد اور ایک خاتون پوری عمر ساتھ نبھانے کا ارادہ کریں۔ اسی کے نتیجے میں ان کے ہاں اولاد ہو گی اور وہ اس کی پرورش کر سکیں گے اور اسی سے صالح تمدن وجود میں آ سکے گا جو کہ نکاح کا اصل مقصد ہے۔ متعہ سے چوری چھپے تعلقات فروغ پا سکتے ہیں جس کے نتیجے میں صالح تمدن تو پیدا نہیں ہو سکتا البتہ یہ ممکن ہے کہ مرد اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد خاتون کو اکیلا چھوڑ جائے اور اگر اس عمل کے نتیجے میں بچہ بھی پیدا ہو جائے تو اس کی کفالت تنہا ماں کی ذمہ داری ہو۔ سنی عالم مفتی محمد شفیع (1896-1976) لکھتے ہیں:

> قرآن مجید نے محرمات [وہ خواتین جن سے نکاح حرام ہے] کا ذکر فرما کر یوں فرمایا ہے کہ ان کے علاوہ اپنے اصول کے ذریعہ حلال عورتیں تلاش کرو، اس حال میں کہ پانی بہانے والے نہ ہوں، یعنی محض شہوت رانی مقصود نہ ہو اور ساتھ ہی محصنین کی بھی قید لگائی ہے، یعنی یہ کہ عفت کا دھیان رکھنے والے ہوں۔ متعہ چونکہ مخصوص وقت کے لئے کیا جاتا ہے، اس لیے اس میں نہ حصول اولاد مقصود ہوتا ہے، نہ گھر بار بسانا، اور نہ عفت و عصمت۔ اور اسی لیے جس عورت سے متعہ کیا جائے، اس کو فریق مخالف [یعنی شیعہ] زوجہ وارثہ [یعنی جس بیوی کو وراثت میں حصہ ملتا ہو] بھی قرار نہیں دیتا اور اس کو ازواج معروفہ کی گنتی میں بھی شمار نہیں کرتا۔ اور چونکہ مقصد محض قضاء شہوت ہے، اس لیے مرد و عورت عارضی طور پر نئے نئے جوڑے تلاش کرتے رہتے ہیں، جب یہ صورت ہے تو متعہ عفت و عصمت کا ضامن نہیں بلکہ دشمن ہے۔[2]

سید ابوالاعلیٰ مودودی (1903-1979) لکھتے ہیں:

> مطلق اباحت، اور بلاضرورت تمتع، حتیٰ کہ منکوحہ بیویوں تک کی موجودگی میں بھی ممتوعات [متعہ کرنے والی خواتین] سے استفادہ کرنا تو ایک ایسی آزادی ہے جسے ذوق سلیم بھی گوارا نہیں کرتا، کجا کہ اسے شریعت محمدیہ کی طرف منسوب کیا جائے اور ائمہ اہل بیت کو اس سے متہم کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ خود شیعہ حضرات میں سے بھی کوئی شریف آدمی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص اس کی بیٹی یا بہن کے لئے نکاح کی بجائے متعہ

کا پیغام دے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جواز متعہ کے لیے معاشرے میں زنان بازاری کی طرح عورتوں کا ایک ایسا ادنی طبقہ موجود رہنا چاہیے جس سے تمتع کرنے کا دروازہ کھلا رہے۔ یا پھر یہ کہ متعہ صرف غریب لوگوں کی بیٹیوں اور بہنوں کے لیے ہو اور اس سے فائدہ اٹھانا خوشحال طبقے کے مردوں کا حق ہو۔ کیا خدا اور رسول کی شریعت سے اس طرح کے غیر منصفانہ قوانین کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اور کیا خدا اور اس کے رسول سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی ایسے فعل کو مباح کر دیں گے جسے ہر شریف عورت اپنے لیے بے عزتی بھی سمجھے اور بے حیائی بھی؟[3]

دوسری دلیل: کیا متعہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حرام کیا؟

اہل تشیع اپنی کتب حدیث سے بکثرت احادیث جواز متعہ میں پیش کرتے ہیں۔ چونکہ یہ احادیث متفق علیہ نہیں ہیں، اس وجہ سے ان پر بحث کرنے کا فائدہ نہیں ہے۔ اس ضمن میں وہ اہل سنت کی کتابوں سے متعدد احادیث بھی نقل کرتے ہیں۔ یہاں ہم ان کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اہل سنت انہیں کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ احادیث ہم شیعہ عالم حسین بخش جاڑا کی تفسیر انوار النجف سے نقل کر رہے ہیں:

ان میں سے پہلی روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے جو جاڑا صاحب نے صحیح مسلم کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ یہ حوالہ درست نہیں ہے۔ یہ روایت ابن حزم نے المحلی میں نقل ضرور کی ہے۔

قال عمر بن الخطاب : متعتان كانتا على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا أنهى عنهما وأضرب عليهما هذا لفظ أيوب ، وفي رواية خالد أنا أنهى عنهما وأعاقب عليهما . متعة النساء . ومتعة الحج

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "دو قسم کا متعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں جائز تھا اور میں انہیں حرام قرار دیتا ہوں۔ ایک متعہ حج اور دوسرا خواتین کے ساتھ متعہ۔ (ابن حزم، المحلی)

دوسری روایت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے صحیح مسلم میں نقل ہوئی ہے۔

وحدثنا الحسن الحلواني. حدثنا عبدالرزاق. أخبرنا ابن جريج. قال: قال عطاء: قدم جابر بن عبدالله معتمرا. فجئناه في منزله. فسأله القوم عن أشياء. ثم ذكروا المتعة. فقال: نعم. استمتعنا على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم. وأبي بكر وعمر.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما عمرہ کے لئے آئے تو لوگ ان کے پاس جمع ہو گئے۔ لوگوں نے مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے کے بعد متعہ کی بحث کو چھیڑا تو جابر نے جواب دیا کہ ہم جناب رسالت مآب اور حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے نصف زمانے میں خود کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد عمر نے اس سے منع کیا ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب النکاح، حدیث 1405)

اہل تشیع کا کہنا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاری کردہ حکم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیسے کوئی تبدیلی کر سکتے تھے؟ اگر انہوں نے ایسا کیا، تو ان کی بات نہیں مانی جائے گی۔ جیسا کہ جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے کہ متعہ عہد رسالت اور عہد ابو بکر میں ہوتا رہا ہے۔

اہل سنت ان احادیث کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ بات ہی درست نہیں ہے کہ متعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جائز تھا اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی ممانعت کر دی۔ بات صرف اتنی تھی کہ جیسے دیگر برائیوں شراب، سود وغیرہ کو یک دم حرام نہیں کیا گیا بلکہ تدریج کا طریقہ اختیار کیا گیا، بالکل اسی طرح متعہ کو بھی تدریجاً حرام کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کی بھرپور ترغیب دلائی جس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگ عارضی جنسی تعلق کی بجائے زندگی بھر کی مستقل رفاقت اختیار کریں۔ اس کے بعد غزوہ خیبر کے موقع پر آپ نے متعہ سے منع فرمایا مگر زیادہ سختی نہیں کی۔ اس کے ایک سال بعد فتح مکہ کے موقع پر اس حرمت کا اعلان شدت سے کر دیا گیا البتہ متعہ کرنے والوں پر کوئی سزا نافذ نہیں کی گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا کہ اسی حکم کو سختی سے نافذ کیا اور اس پر بدکاری کی سزا دینے کا اعلان کیا۔

رہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث تو وہ خواتین سے متعہ کے بارے میں نہیں ہے، اس کا تعلق حج کے متعہ سے ہے یعنی ایک سفر میں حج اور عمرہ کو اکٹھا کرنا جسے حج تمتع کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ایک سفر میں حج اور عمرہ کو اکٹھا کرنا غلط ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے بھی یہی تھی۔ آپ نے اس کی ممانعت کرنا چاہی، لیکن پھر دیگر صحابہ کے مشورے سے اسے منع نہیں کیا۔ احادیث میں جہاں جہاں صحابہ کرام کے متعہ کرنے کا ذکر آتا ہے، اس سے مراد "حج تمتع" ہوتا ہے نہ کہ "متعہ نکاح۔"

ان احادیث کے علاوہ اہل سنت یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

وحدثني أبو الطاهر وحرملة بن يحيى. قالا: أخبرنا ابن وهب. أخبرني يونس عن ابن شهاب، عن الحسن وعبدالله ابني محمد بن علي بن أبي طالب، عن أبيهما ؛ أنه سمع علي بن أبي طالب يقول لابن عباس : نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم، عن متعة النساء، يوم خيبر. وعن أكل لحوم الحمر الإنسية.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خیبر کے موقع پر خواتین سے متعہ کرنے اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔" (بخاری و مسلم، کتاب النکاح، حدیث 1407)

چونکہ یہ حدیث شیعہ حضرات تسلیم نہیں کرتے، اس وجہ سے ان کے نزدیک متعہ جائز ہی ہے۔

تیسری دلیل: صحابہ کا عمل

اہل تشیع متعہ کے حق میں یہ روایت بھی پیش کرتے ہیں:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے متعہ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواز کا فتوی دیا۔ سائل نے کہا کہ آپ کے والد نے تو اس کی حرمت کا حکم دیا ہے، اس کے جواب میں ابن عمر نے کہا کہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنت قرار دیا ہو، اگر میرا باپ اس سے روکے تو کیا تم سنت رسول پر عمل کرو گے یا میرے باپ کا کہا مانو گے۔ (ترمذی)

یہ حدیث اہل سنت کے نزدیک موضوع اور جعلی ہے۔ ترمذی میں یہ حدیث کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ مسند احمد میں البتہ اس سے ملتی

جعلی ایک حدیث ہے اور وہ یہ ہے:

حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ إِيَادِ بْنِ لَقِيطٍ حَدَّثَنَا إِيَادٌ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ نُعْمٍ أَوْ نُعَيْمٍ الْأَعْرَجِيِّ شَكَّ أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ سَأَلَ رَجُلٌ ابْنَ عُمَرَ عَنْ الْمُتْعَةِ وَأَنَا عِنْدَهُ مُتْعَةِ النِّسَاءِ فَقَالَ وَاللَّهِ مَا كُنَّا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَانِينَ وَلَا مُسَافِحِينَ ثُمَّ قَالَ وَاللَّهِ لَقَدْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لَيَكُونَنَّ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ الْمَسِيحُ الدَّجَّالُ وَكَذَّابُونَ ثَلَاثُونَ أَوْ أَكْثَرُ

ایک شخص نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے خواتین سے متعہ کے بارے میں پوچھا جبکہ میں ان کے پاس تھا۔ وہ بولے: اللہ کی قسم ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ تو بدکار تھے اور نہ ہی چوری چھپے آشنائی کرنے والے تھے۔ پھر بولے: اللہ کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ قیامت سے پہلے ضرور مسیح دجال اور تیس یا اس سے زائد کذاب ہوں گے۔ (مسند احمد، باب ابن عمر، حدیث 5444, 5546)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما متعہ کی حرمت ہی کے قائل تھے اور اسے بدکاری اور چوری چھپے آشنائی کے مترادف سمجھتے تھے۔ جو روایت جاڑا صاحب نے بیان کی ہے، وہ خواتین سے متعہ کے بارے میں نہیں بلکہ "متعہ حج" کے بارے میں ہے جسے حج تمتع کہا جاتا ہے۔ اس حدیث کو امام نووی نے اپنی کتاب "المجموع شرح المهذب" میں درج کیا ہے۔

سئل ابن عمر عن متعة الحج فأمر بها فقيل : إنك تخالف أباك . فقال : إن أبي لم يقل الذي يقولون ، إنما قال : أفردوا الحج من العمرة ، أي : إن العمرة لتتم في أشهر الحج ، فجعلتموها أنتم حراما ، وعاقبتم الناس عليها ، وقد أحلها الله عز وجل ، وعمل بها رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : فإذا أكثروا عليه قال : فكتاب الله أحق أن يتبع أم عمر ؟

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے متعہ حج (یعنی حج اور عمرہ کو ایک سفر میں کرنا) کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اس کی اجازت دی۔ کہا گیا: "آپ کے والد تو اس کی مخالفت کرتے تھے۔" بولے: "میرے والد وہ نہیں کہتے تھے جو تم کہہ رہے ہو۔ وہ تو بس یہی کہتے تھے کہ حج اور عمرہ کو الگ الگ کیا کرو۔ یعنی عمرہ حج کے مہینوں میں مکمل کر لیا جائے۔ تم نے اسے حرام ٹھہرا لیا ہے اور لوگوں کا اس پر معاقبہ کرتے ہو جبکہ اللہ عزوجل نے اسے حلال ٹھہرایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کیا ہے۔" جب لوگ بہت زیادہ بات کرتے تو وہ کہا کرتے تھے: "اللہ کی کتاب پیروی کرنے کے لئے زیادہ حق دار ہے یا پھر عمر؟"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں صحابہ کرام کے متعہ کرنے کا ذکر آتا ہے، اس سے مراد حج تمتع ہوتی ہے، نہ کہ خواتین کا متعہ۔ اہل تشیع یہ روایت بھی پیش کرتے ہیں:

ابو نضرۃ کا بیان ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے آیت متعہ تلاوت کی تو ابن عباس نے کہا: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ إلى أَجلٍ مُسَمًّى "یعنی جب تم ان سے ایک متعین مدت کے لئے متعہ کرو"۔ راوی نے کہا، ہم تو ایسا نہیں پڑھا کرتے تھے تو ابن عباس نے کہا: "خدا کی قسم اسی طرح نازل ہوئی تھی۔" (مستدرک حاکم)

یہ حدیث اہل سنت کے نزدیک موضوع اور جعلی ہے۔ اول تو یہ روایت خود قرآن مجید کے خلاف ہے جو تواتر سے ثابت ہے۔ ایسا کس

طرح ممکن ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما قرآن میں إلى أَجلٍ مُسَمًّى کے الفاظ کا اضافہ کر دیں۔ الفاظ کا اضافہ کر دیں۔ پھر دیگر صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما متعہ کی حرمت کا فتوی دیتے تھے، البتہ انتہائی اضطرار کی حالت میں اس کے جواز کے قائل تھے اور اس بات سے بھی انہوں نے رجوع کر لیا تھا۔

کیا متعہ عملاً ہوتا ہے؟

یہ سوال ایسا ہے کہ اس کا جواب تلاش کرنا ایک مشکل کام ہے۔ دنیا کے باقی علاقوں کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں البتہ اگر برصغیر کے اہل تشیع سے اس ضمن میں استفسار کیا جائے تو وہ بالعموم یہ کہتے ہیں کہ یہ جائز تو ہے مگر عملاً ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا ہے کیونکہ ہماری معاشرت میں اس کا رواج نہیں ہے۔ اہل سنت کے بعض لوگ اس معاملے میں متعہ سے متعلق خاص کر عید غدیر کے موقع پر اہل تشیع کے کچھ واقعات پیش کرتے ہیں مگر ان واقعات کی تصدیق مشکل کام ہے۔ یہ بات بہرحال طے ہے کہ شریف شیعہ گھرانوں کی خواتین تو بہرحال متعہ نہیں کرتیں۔

اسائنمنٹس

1. متعہ کے فوائد پر شیعہ نقطہ نظر بیان کیجیے اور یہ بتائیے کہ اہل سنت کے نزدیک متعہ کے نقصانات کیا ہے؟
2. قرآن مجید اور احادیث سے متعہ کے حق میں اور اس کے خلاف دونوں قسم کے دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کو دو کالمز میں لکھیے۔
3. اہل تشیع کے نزدیک متعہ کی شرائط کیا ہیں؟
4. متعہ کے خلاف اہل سنت کے عقلی دلائل کا جائزہ لیجیے اور یہ بتائیے کہ اہل تشیع ان کا کیا جواب دیتے ہیں؟

---

[1] مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ، ترجمہ سید صفدر حسین نجفی۔

[2] تفسیر معارف القرآن۔ آیت 4:24

[3] تفہیم القرآن، سورۃ المومنون

سبق 7: تقیہ اور عقیدہ مہدویت

اس سبق میں ہم اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین دو اہم اختلافی عقائد کا جائزہ لیں گے، ایک تقیہ سے متعلق ہے اور دوسرا عقیدہ مہدویت سے۔ ان کا باہمی کوئی تعلق نہیں مگر ہم نے انہیں ایک سبق میں اس وجہ سے اکٹھا کیا ہے کہ ان پر بہت زیادہ بحث و تمحیص کی گنجائش نہیں ہے۔

تقیہ

تقیہ بھی اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین ایک اہم اختلافی مسئلہ ہے۔ تقیہ کا مفہوم ہے چھپانا۔ اہل تشیع کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر حالات نامساعد ہوں تو انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے ایمان کو چھپا کر رکھے اور کھل کر اس کا اظہار نہ کرے۔ یہ عمل باعث اجر و ثواب ہے۔

اہل تشیع کی دلیل یہ آیات ہیں:

لا يَتَّخِذْ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنْ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلاَّ أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً وَيُحَذِّرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ.

"اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ مومنین کے خلاف کفار کو دوست نہ بنائیں۔ جو کوئی ایسا کرے گا تو اس کا اللہ سے کسی چیز کا واسطہ نہ رہا۔ سوائے اس کے کہ تم اپنا بچاؤ کرنا چاہو۔ اللہ تمہیں اپنی ذات [کے غضب] سے ڈراتا ہے اور اسی کی جانب لوٹ کر جانا ہے۔" (آل عمران 3:28)

مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلاَّ مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالإِيمَانِ وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْراً فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنْ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ.

"جس نے اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس سے کفر کیا [وہی جھوٹے ہیں] سوائے اس کے کہ وہ شخص جسے مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ لیکن جس نے اپنے سینہ کو کفر کے لئے کھول دیا تو ان کے لئے اللہ کا غضب ہے اور بڑا عذاب ہے۔" (النحل 16:106)

مشہور شیعہ عالم مکارم شیرازی لکھتے ہیں:

یہ صحیح ہے کہ کبھی انسان اعلیٰ ترین مقاصد مثلاً حفظ شرافت، تقویت حق اور باطل کی کمر توڑنے کے لئے اپنی جان عزیز تک کو فدا کرنے کو تیار ہوتا ہے لیکن کیا کوئی عقل مند بغیر کسی اہم مقصد کے اپنی جان خطرے میں ڈالنے کو جائز کہہ سکتا ہے؟ اسلام نے صراحت سے اجازت دی ہے کہ جب انسان کی جان، مال اور عزت و آبرو خطرے میں ہو اور اظہار حق سے کوئی اہم نتیجہ اور فائدہ بھی حاصل نہ ہوتا ہو تو وقتی طور پر اظہار حق نہ کیا جائے اور اپنے فرائض مخفی طور پر ادا کر لیے جائیں۔۔۔۔

تمام مقامات پر تقیہ کا حکم ایک جیسا نہیں بلکہ وہ کبھی واجب ہے، کبھی حرام ہے اور کبھی مباح ہے۔

تقیہ اس حالت میں واجب ہوتا ہے جب بغیر کسی اہم فائدے کے انسان کی جان خطرے سے دوچار ہو لیکن جہاں تقیہ باطل کی ترویج لوگوں کی گمراہی اور ظلم و ستم کی تقویت کا باعث ہو، وہاں حرام اور ممنوع ہے۔۔۔۔

دنیا کے تمام عقل مند جب کبھی اپنے آپ کو کسی دوراہے پر پاتے ہیں جہاں یا تو انہیں اپنے عقیدے کو چھپانا پڑتا ہے یا عقیدے کا اظہار کر کے اپنی جان، مال اور عزت کو خطرے تو ڈالنا پڑتا ہے تو اگر عقیدے کا اظہار کرنا جان و مال اور عزت و آبرو کی قربانی کی قیمت رکھتا ہو تو وہ فداکاری کی راہ کو درست سمجھتے ہیں لیکن اگر اس کا واضح فائدہ نظر نہ آئے تو پھر عقیدے کو چھپانا بہتر سمجھتے ہیں۔ (تفسیر نمونہ، تفسیر آیت 3:28)

اہل سنت کا نقطہ نظر اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ان کے ہاں بھی اصول یہی ہے کہ کسی شخص کو اگر مجبور کیا جائے تو اسے رخصت حاصل ہے کہ وہ کلمہ کفر کہہ کر اپنی جان بچالے بشرطیکہ اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو۔ لیکن ان کے نزدیک افضل عمل یہی ہے کہ وہ کلمہ حق کہہ کر جان دے دے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکتا ہو تو پھر اس کے لئے یہ آسانی کر دی گئی ہے۔ یہ آسانی ہی ہے اور اسے فضیلت کا عمل نہیں کہنا چاہیے۔ اگر انسان کی جان اور ایمان خطرے میں ہو اور اس کے ہجرت ممکن ہو، تو اسے چاہیے کہ وہ علاقہ ہی چھوڑ دے اور ایسی جگہ چلا جائے جہاں اس کے لئے اپنے دین پر عمل کرنا اور حق کا اظہار کرنا ممکن ہو۔ طویل عرصے تک ایسی جگہ پر رہنا اس کے لئے جائز نہیں ہے۔ اس کے برعکس اہل تشیع کا موقف یہ ہے کہ تقیہ لامحدود مدت کے لیے جائز ہے۔ وہ طویل عرصہ اہل سنت کے درمیان رہے اور رہ رہے ہیں اور تقیہ سے کام لیتے رہے ہیں البتہ جہاں جہاں انہیں حکومت ملی ہے، وہاں انہوں نے تقیہ کو چھوڑ دیا ہے۔

اصول کے اعتبار سے اہل سنت اور اہل تشیع کے نقطہ ہائے نظر میں زیادہ فرق نہیں ہے البتہ فرق تقیہ کے اصول کے استعمال میں ہے۔ بعض شیعہ حضرات کے سامنے جب یہ سوال پیش کیا جاتا ہے کہ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ خلافت ان کا دینی حق ہے، تو انہوں نے سیدنا ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافت کو قبول کیسے کر لیا یا پھر اگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت ظلم پر مبنی تھی تو حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہمانے ان کی حکومت کے ظلم و جبر کو قبول کیسے کر لیا؟ تو اس کے جواب میں اہل تشیع یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس موقع پر تقیہ سے کام لیا۔ اس پر اہل سنت نہایت شدت سے اس کی مذمت کرتے ہیں کہ تقیہ کرنا ان کے جیسے بہادروں کے شایان شان نہ تھا۔ اسی آیت کی تفسیر میں سنی مفسر پیر محمد کرم شاہ الازہری (1917-1998) لکھتے ہیں:

اگر وہ اپنی جان بچانے کے لئے زبان پر کلمہ کفر لائے اور اس کا دل مطمئن ہو تو اسے ایسا کرنے کی رخصت تو ہے لیکن اس کا ایمان پر ڈٹے رہنا اور اپنی جان دے دینا بہت افضل ہے۔

اس چیز کو اس تقیہ سے دور کا واسطہ بھی نہیں جو مذہب شیعہ کا اصل عظیم ہے اور بڑا کار ثواب ہے۔ جس کی فضیلت بیان کرتے ہوئے وہ یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ اگرچہ خلفائے ثلاثہ نے قرآن کی تحریف کر دی، احکام شریعت کو بدل ڈالا، سنت رسول کو مٹا دیا، لیکن حضرت علی نے تقیہ پر عمل کیا اور خاموش رہے بلکہ کاروبار حکومت میں ان کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ ان کے مال غنیمت سے اپنا حصہ قبول کرتے رہے، ان کے پیچھے نمازیں ادا کرتے رہے۔ استغفر اللہ۔ شاہ مرداں، شیر یزداں علیہ وآلہ افضل الثناء و اکمل االرضوان کی ذات مقدس پر یہ کتنا ناپاک بہتان ہے۔ ایسی بہتان تراشی پر ہم اللہ تعالی سے پناہ مانگتے ہیں۔"[1]

اسی بات کو شیعہ عالم ڈاکٹر موسی الموسوی نے بیان کیا ہے:

یہاں ان لوگوں کے کردار کی باری آئی جنہوں نے حضرت علی اور ان کی شخصیت کو ختم کرنا چاہا اور بالواسطہ طور پر انہیں الزامات کا نشانہ بنانا چاہا۔ اس طرح زمانہ رسالت و عہد صحابہ کے متعلق ہر چیز کو ختم کیا جا سکتا ہے کیونکہ زمانہ رسالت کو، جس میں کبار صحابہ بھی شامل ہیں، تاریک ترین مظہر میں اسی وقت پیش کیا جا سکتا ہے جبکہ اس اسلامی معاشرہ کی اللہ تعالی کے صریح احکام سے بغاوت کا نقشہ کھینچا جائے اور یہ امر اس بات پر موقوف تھا کہ حضرت علی کی خلافت کو اللہ تعالی کی طرف سے منصوص باور کرایا جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے صحابہ تک اس نص کی تبلیغ اور صحابہ کے اس نص کو جان لینے باوصف اس کی خلاف ورزی اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک دغاباز، مداہنت کیش اور چاپلوس آدمی کی شکل میں تصویر کشی کی جائے جو پچیس برس تک اپنے پہلے خلفاء ثلاثہ کا بظاہر دیانتدار مشیر اور گرم جوش دوست بنا رہا جو ان کی مدح میں رطب اللسان اور ان کی تعریف میں بہترین کلمات نچھاور کرنے والا ہو اور اس کا دل اس کی زبان کے ساتھ نہ تھا۔ جو وہ کرتا تھا، اس پر اس کا ایمان نہ تھا، یہاں تک کہ اس نے مجبوری کی حالت میں ہی اپنی بیٹی ام کلثوم، عمر بن خطاب کے عقد میں دے دی اور اپنے بیٹوں کے نام ابو بکر و عمر و عثمان رکھے، حالانکہ وہ ان کے یہ نام رکھنے پر راضی نہ تھے۔

علمائے شیعہ اور ان کی احادیث کے راویوں، اللہ انہیں معاف کرے، نے حضرت علی کے متعلق صراحۃ یا کنایۃ جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ قیامت کے دن جب حضرت علی انے ان کے متعلق اپنے رب سے شکایت کی تو ان لوگوں کو موقف کیا ہو گا۔[2]

عقیدہ مہدویت

اہل تشیع کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت مہدی حضرت حسن عسکری رحمہ اللہ (232-260/846-874) کے بیٹے تھے جو کہ بچپن میں غائب ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وقت کا بادشاہ انہیں قتل کروا دینا چاہتا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے روپوشی کی زندگی اختیار کی اور قیامت کے قریب تک زندہ اور روپوش رہیں گے۔ قیامت کے قریب وہ خود کو ظاہر کر دیں گے اور ان کی حکومت قائم ہو جائے گی جو صحیح عادلانہ اور خلافت راشدہ پر مبنی حکومت ہو گی۔ امام مہدی کی غیبت (غائب ہونا) کو وہ دو حصوں میں بیان کرتے ہیں۔ ایک زمانہ "غیبت صغری (Minor Occultation)" کا ہے جو کہ 260/874 سے لے کر 329/941 ہے۔ اس عرصے کے دوران امام مہدی اپنے ساتھیوں سے ملتے تھے اور وہ ان سے ہدایات حاصل کیا کرتے تھے۔ 329/941 کے بعد "غیبت کبری (Major Occultation)" کا دور شروع ہوا جو اب تک جاری ہے اور قرب قیامت تک جاری رہے گا۔ اس زمانے میں امام مہدی سوائے چند بہت ہی قریبی ساتھیوں کے کسی سے نہیں ملتے۔

اہل تشیع کے نقطہ نظر کے دلائل ان کی اپنی کتب حدیث میں ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، سیدنا علی، سیدنا حسن و حسین رضی اللہ عنہم اور بعد کے ائمہ اہل بیت سے ان کے متعلق روایات شامل ہیں۔

اہل سنت کی اکثریت کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت مہدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں سے ہوں گے اور قیامت کے

قریب پیدا ہوں گے اور ان کے زمانے میں خلافت راشدہ دوبارہ قائم ہو جائے گی۔ ان دونوں نظریات میں فرق یہی ہے کہ اہل سنت کے نزدیک وہ آخری زمانہ میں پیدا ہوں گے جبکہ اہل تشیع کے نزدیک وہ اب سے گیارہ بارہ سو برس پہلے پیدا ہو چکے ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔ اسی زمانے میں سیدنا عیسی علیہ الصلوۃ والسلام کا نزول ہو گا اور آپ امام مہدی کے پیچھے نماز ادا کریں گے۔ پھر خلافت سیدنا عیسی علیہ الصلوۃ والسلام کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور وہ بحیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتی کے دنیا پر حکومت کریں گے۔

اس کے علاوہ جو اختلافات ہیں، وہ خلافت راشدہ کے تصور کے ہیں۔ اہل تشیع کے نزدیک امام مہدی کی خلافت ایک شیعہ خلافت ہو گی جس میں اہل تشیع غالب قوت ہوں گے اور سنیوں کی بیخ کنی کریں گے۔ اہل سنت کے نزدیک امام مہدی کی خلافت سنی خلافت ہو گی اور وہ سنی مکتب فکر کے مطابق حکومت کریں گے۔

اس معاملے میں ہر فریق اپنی اپنی روایات پیش کرتا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک اہل تشیع کی روایات ناقابل اعتبار ہیں اور کچھ ایسا ہی معاملہ دوسری جانب بھی ہے۔ چونکہ ان دلائل کی کوئی متفق علیہ بنیاد موجود نہیں ہے، اس وجہ سے اس مسئلے میں کسی نتیجے پر پہنچنا ناممکن ہے۔

اہل سنت کے ایک اقلیتی گروہ کا نقطہ نظر اس معاملے میں مختلف ہے۔ ان کے نزدیک امام مہدی سے متعلق جتنی روایات ہیں، وہ اہل تشیع کی وضع کردہ ہیں اور شیعہ راویوں کے توسط سے اہل سنت کی کتب میں داخل ہو گئی ہیں۔ اس نقطہ نظر کے مطابق امام مہدی ایک تصوراتی شخصیت ہیں۔ اہل تشیع نے یہ تصور اس لیے وضع کیا کہ امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ (232-260/846-874) کی کوئی اولاد نہ تھی اور ان کے بعد امامت کے سلسلے کو چلانا ممکن نہ تھا۔ بعد میں جب ان سے متعلق روایات اہل سنت کی کتابوں کا حصہ بن گئیں تو اہل سنت نے اس تصور کو اپنے نقطہ نظر کے مطابق ایڈجسٹ کر لیا۔ اس نقطہ نظر کو برصغیر میں علامہ تمنا عمادی (1888-1972)، شبیر احمد ازہر میرٹھی اور حبیب الرحمان کاندھلوی (1924-1991) نے پیش کیا۔ اس کی تردید اہل سنت اور اہل تشیع دونوں ہی کی جانب سے آئی ہے۔ حال ہی میں ایک سلفی عالم محمد اسماعیل المقدم کی عربی کتاب "المہدی" اس نقطہ نظر کی تردید میں شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے امام مہدی سے متعلق تمام روایات کو اکٹھا کر کے، ان کی تخریج (کسی حدیث کی مختلف اسناد کو اکٹھا کرنا) کی ہے اور ان کے راویوں کا جائزہ لے کر بیان کیا ہے کہ اس ضمن میں اکثر روایات صحیح ہیں۔

اسائن منٹس

1. کیا نبی کریم سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے کبھی تقیہ کیا؟ اس ضمن میں قرآن و حدیث سے اپنے دلائل پیش کیجیے؟
2. کیا تقیہ کو اضطرار میں حلال سمجھا جائے گا یا حرام؟ کوئی ایسی مثال پیش کیجیے جس میں تقیہ کرنا ضروری ہو۔

3. حضرت مہدی سے متعلق اہل تشیع اور اہل سنت کے مابین کن امور پر اختلاف اور کن امور پر اتفاق پایا جاتا ہے؟

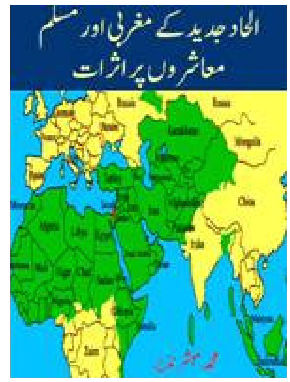

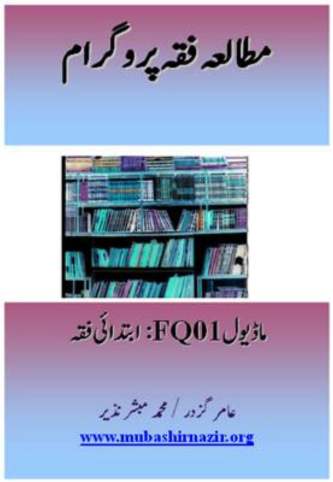

تعمیر شخصیت

حسد کرنے والا کسی اور کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ وہ خود ہی کو حسد کی آگ میں جلا رہا ہوتا ہے۔

---

[1] محمد کرم شاہ الازہری۔ تفسیر ضیاء القرآن، زیر آیت 16:106

[2] موسی الموسوی (اردو ترجمہ: ابو مسعود آل امام)۔ اصلاح شیعہ۔ ص 71۔

سبق 8: محرم الحرام کی رسوم اور باغ فدک

اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان ایک بڑا عملی اختلاف محرم الحرام کی رسوم کا ہے۔ اس کے علاوہ باغ فدک ایک تاریخی اور شرعی مسئلہ ہے جس کے معاملے میں اہل تشیع اور اہل سنت کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان دونوں مسائل کا مطالعہ ہم اس سبق میں کریں گے۔

محرم الحرام کی رسوم

محرم کا مہینہ ہجری کیلنڈر کا پہلا مہینہ ہے۔ اس مہینے کی دس تاریخ، جسے "عاشورہ" کہا جاتا ہے، کو اہل سنت اور اہل تشیع دونوں ہی کے ہاں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اہل سنت کے نزدیک اس دن کی اہمیت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دن کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ بعض میں یہ فرضیت منسوخ ہو گئی البتہ اس دن کے روزے کا مستحب ہونا اب بھی باقی ہے۔ تاریخ اسلامی میں اس دن نواسہ رسول سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی جو کہ اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کے نزدیک پوری تاریخ کے بڑے سانحات میں سے ایک ہے۔

اہل تشیع کے نزدیک اس دن کی اہمیت پورے سال میں کلیدی ہے۔ محرم کا چاند نظر آتے ہی سوگ اور ماتم کی ایک فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ دس دن اہل تشیع کی مساجد، جنہیں امام بارگاہ کہا جاتا ہے، میں مجالس منعقد ہوتی ہیں جن میں واقعہ کربلا سے متعلق روایات کو رو رو کر بیان کیا جاتا ہے، نوحے پڑھے جاتے ہیں، مرثیے کہے جاتے ہیں اور پورے دس دن نہایت سوگ میں گزرتے ہیں۔ اس دوران شیعہ ماتم کرتے ہیں۔ بعض حضرات یہ کام اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں جبکہ بعض اس موقع پر چھریوں اور زنجیروں سے خود کو زخمی کر لیتے ہیں اور بعض نوجوان جلتے انگاروں پر ننگے پاؤں ماتم کرتے ہیں۔

یہ سلسلہ عاشورہ کے دن اپنے عروج پر پہنچتا ہے اور ہر شہر میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا جاتا ہے جس میں شرکاء سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے کربلا میں مزار کی شبیہ بناتے ہیں، مرثیے پڑھتے ہیں اور ماتم کرتے ہیں۔ شہیدان کربلا کے بارے میں جو شیعی روایات ہیں، ان کے بیان کردہ واقعات کے مطابق پورے واقعے کی عملی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ بعض لوگ کربلا میں زندہ بچ جانے والوں کی یاد میں قیدی بنتے ہیں اور زنجیروں میں جکڑے جاتے ہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں میں ان رسوم میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے البتہ سوگ اور غم منانا ان کا بنیادی جز ہے۔ عزاداری کا فلسفہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اہل بیت پر جو مظالم ہوئے، ان کا غم کو تازہ رکھنا عزاداری کا بنیادی مقصد ہے۔

علمائے اہل سنت کا اس ضمن میں نظریہ یہ ہے کہ یہ سب رسوم بدعت اور ناجائز ہیں اور اسلام میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے

برعکس سنی عوام میں سے بہت سے لوگ البتہ عام طور پر ان جلوسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ ماتم میں تو شرکت نہیں کرتے البتہ اس جلوس کو دیکھتے ہیں اور مرثیہ وغیرہ کو سن کر اپنے غم کا اظہار کرتے ہیں۔

سنی ہوں یا شیعہ، دونوں کا استدلال اپنی اپنی کتب کی احادیث سے ہے۔ شیعہ حضرات عام طور پر اس ضمن میں جو احادیث پیش کرتے ہیں، وہ ائمہ اہل بیت کے اقوال ہیں جو ان کی اپنی کتب میں موجود ہیں۔ اس کی مثال امام رضا رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے:

جو ہماری مصیبت کا ذکر کرے گا اور ہمارے مصائب پر روئے گا، وہ روز محشر ہمارے ساتھ ہمارے ہی درجہ میں ہو گا۔ ہماری مصیبت پر جس کی آنکھیں روئیں گی، اس کی آنکھیں قیامت کے دن، کہ جب ہر آنکھ روتی ہو گی، نہیں روئیں گی۔ اور جو شخص کسی ایسی مجلس میں بیٹھے گا کہ جہاں ہمارے امر کا احیاء ہوتا ہو تو اس کا دل روز قیامت زندہ ہو گا جبکہ اس روز ہر دل مردہ ہو گا۔[1]

ماتم کی حرمت میں اہل سنت کے دلائل

اہل سنت ان اقوال کی نسبت ان ائمہ کی جانب درست نہیں سمجھتے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ شیعہ کتب میں بھی ائمہ اہل بیت کے بارے میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ انہوں نے اسی انداز میں محرم کے دوران جلوس نکالے ہوں اور ماتم کیا ہو۔ ان کا استدلال قرآن مجید کی ان آیات سے ہے جن میں صبر کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ان احادیث سے استدلال کرتے ہے جو چھاتی پیٹنے، نوحہ کرنے اور ماتم کی مذمت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہیں۔ ہم ان آیات اور بطور مثال دو احادیث کو درج کر رہے ہیں:

وَلا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لا تَشْعُرُونَ. وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنْ الأَمْوَالِ وَالأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرْ الصَّابِرِينَ. الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ. (البقرۃ2:154-156)

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں، انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں ان کا شعور نہیں ہے۔ ہم ضرور تمہیں خوف، بھوک اور مال، جان اور پھلوں میں کمی سے آزمائیں گے۔ صبر کرنے والوں کو بشارت دے دیجیے جنہیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اسی کی جانب پلٹنا ہے۔"

حدثنا أبو نعيم: حدثنا سفيان: حدثنا زبيد اليامي، عن إبراهيم، عن مسروق، عن عبد الله رضي الله عنه قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: (ليس منا من لطم الخدود، وشق الجيوب، ودعا بدعوى الجاهلية).

عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو چہرہ پیٹے، گریبان چاک کرے اور جاہلیت کی طرح چیخ و پکار کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (بخاری، کتاب الجنائز، حدیث1232)

حدثنا أبو بكر بن أبي شيبة. حدثنا عفان. حدثنا أبان بن يزيد. ح وحدثني إسحاق بن منصور (واللفظ له) أخبرنا حبان بن هلال. حدثنا أبان. حدثنا يحيى ؛ أن زيدا حدثه ؛ أن أبا سلام حدثه ؛ أن أبا مالك الأشعري حدثه ؛ أن النبي صلى الله

عليه وسلم قال:

"أربع في أمتي من أمر الجاهلية، لا يتركونهن: الفخر في الأحساب، والطعن في الأنساب، والاستسقاء بالنجوم، والنياحة ". وقال: " النائحة إذا لم تتب قبل موتها، تقام يوم القيامة وعليها سربال من قطران، ودرع من جرب".

ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں جاہلیت کے چار امور ہیں جنہیں وہ وہ ترک نہ کرے گی: حسب [اپنے خاندان کو اونچا سمجھنا] میں فخر، نسب میں طعنہ بازی، ستاروں کو دیکھ کر بارش طلب کرنا اور نوحہ کرنا۔ " فرمایا: "نوحہ کرنے والی اگر موت سے پہلے توبہ نہ کرے گی تو وہ قیامت کے دن اس طرح کھڑی کی جائے گی کہ اسے پگھلے ہوئے تانبے اور خارش کی قمیص پہنائی جائے گی۔ (مسلم، کتاب الجنائز، حدیث 934)

شیعہ حضرات ان احادیث کو درست تسلیم نہیں کرتے کیونکہ یہ اہل سنت کی کتب سے نقل ہوئی ہیں۔ اس کے جواب میں اہل سنت خود اہل تشیع کی مستند کتابوں سے احادیث اور اقوال ائمہ پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح اہل تشیع، اہل سنت کی کتب سے ماتم کے جواز میں کچھ دلائل پیش کرتے ہیں۔ یہاں ہم ان کا جائزہ پیش کریں گے۔

یہاں ہم کچھ تفصیل اہل سنت کے عالم علامہ غلام رسول سعیدی (b. 1937) کی کتاب شرح صحیح مسلم، کتاب الجنائز میں ماتم کی بحث سے پیش کر رہے ہیں اور کچھ تفصیل ہم نے خود اہل تشیع کی کتب سے اخذ کی ہے۔

وقال (عليه السلام): يَنْزِلُ الصَّبْرُ عَلَى قَدْرِ الْمُصِيبَةِ ومَنْ ضَرَبَ يَدَهُ عَلَى فَخِذِهِ عِنْدَ مُصِيبَتِهِ حَبِطَ عَمَلُهُ.

سیدنا علی علیہ السلام نے فرمایا: صبر مصیبت کے مطابق نازل ہوتا ہے۔ جس نے مصیبت کے وقت اپنے ہاتھ کو ران پر مارا، اس کے اعمال ضائع ہو گئے۔ (نہج البلاغہ، نمبر 144)

ورُوِيَ أَنَّهُ (عليه السلام) لَمَّا وَرَدَ الْكُوفَةَ قَادِماً مِنْ صِفِّينَ مَرَّ بِالشِّبَامِيِّينَ فَسَمِعَ بُكَاءَ النِّسَاءِ عَلَى قَتْلَى صِفِّينَ وخَرَجَ إِلَيْهِ حَرْبُ بْنُ شُرَحْبِيلَ الشِّبَامِيِّ وَكَانَ مِنْ وُجُوهِ قَوْمِهِ فَقَالَ (عليه السلام) لَهُ أَ تَغْلِبُكُمْ نِسَاؤُكُمْ عَلَى مَا أَسْمَعُ أَ لا تَنْهَوْنَهُنَّ عَنْ هَذَا الرَّنِينِ وأَقْبَلَ حَرْبٌ يَمْشِي مَعَهُ وهُوَ (عليه السلام) رَاكِبٌ فَقَالَ (عليه السلام) ارْجِعْ فَإِنَّ مَشْيَ مِثْلِكَ مَعَ مِثْلِي فِتْنَةٌ لِلْوَالِي ومَذَلَّةٌ لِلْمُؤْمِنِ

روایت کیا گیا کہ ہے سیدنا علی علیہ السلام جب صفین سے واپسی پر کوفہ پہنچے تو آپ کا گزر قبیلہ شبام سے ہوا۔ آپ نے صفین میں قتل پر خواتین کی گریہ وزاری سنی۔ آپ کے پاس حرب بن شرحبیل شبامی آئے جو سردار قبیلہ تھے۔ آپ علیہ السلام نے ان سے فرمایا: "جو میں سن رہا ہوں، کیا اس معاملے میں تمہاری خواتین تم پر غالب آ گئی ہیں۔ تم انہیں اس طرح کی آہ و بکا سے کیوں ہیں روکتے؟" یہ کہہ کر حضرت آگے بڑھ گئے۔ آپ سوار تھے جبکہ حرب آپ کے ساتھ ساتھ پیدل تھے۔ آپ نے فرمایا: "واپس جاؤ کیونکہ تمہارا اس طرح سواری کے ساتھ پیدل چلنا حاکم کے لئے فتنہ اور مومن کے لیے ذلت کا باعث ہے۔" (نہج البلاغہ، نمبر 322)

شارح نہج البلاغہ سید ذیشان حیدر جوادی کہتے ہیں کہ اس کا تعلق انسان کی ذاتی تکلیف سے ہے، جس پر صبر کرنا چاہیے۔ اس طرح وہ اشارہ دیتے ہیں کہ واقعہ کربلا پر ماتم اور رونا پیٹنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے مستثنیٰ ہے۔

دوسرے ارشاد کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس طرح رونا ممنوع ہے جس سے دشمن کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر ہو۔ اہل سنت اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ جنگ صفین سے واپسی کے موقع پر کون سے دشمن تھے جن کے سامنے آپ اپنی کمزوری ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے۔ رہا واقعہ کربلا کے غم کا استثنا تو اس کا ذکر کہیں بھی قول مذکور میں نہیں ہے۔

عن سهل بن زياد، عن أحمد بن محمد بن أبي نصر، والحسن ابن علي جميعا، عن أبي جميلة، عن جابر، عن أبي جعفر (عليه السلام) قال: قلت له: ما الجزع؟ قال: أشد الجزع الصراخ بالويل والعويل ولطم الوجه والصدر وجز الشعر من النواصي ومن أقام النواحة فقد ترك الصبر وأخذ في غير طريقه ومن صبر واسترجع وحمد الله عزوجل فقد رضي بما صنع الله ووقع أجره على الله ومن لم يفعل ذلك جرى عليه القضاء وهو ذميم وأحبط الله تعالى أجره.

ابو جعفر علیہ السلام (امام محمد باقر) سے پوچھا گیا: "بے صبری کیا ہے؟" فرمایا: "سب سے بڑھ کر بے صبری یہ ہے کہ آدمی ہائے وائے چلائے اور سینے اور چہرے پر مارے، پیشانی سے بال نوچے۔ جس نے نوحہ کیا، اس نے صبر کو ترک کر دیا اور اس کے خلاف طریقہ اختیار کیا۔ جس نے صبر کیا، اس نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور اللہ عزوجل کی حمد و ثنا کی اور اللہ کے کام پر راضی ہوا تو اللہ پر اس کا اجر واقع ہو گیا۔ اور جس نے اس کے خلاف کیا تو اس پر تقدیر کا فیصلہ تو ہو کر رہے گا مگر اللہ اس کا اجر ضائع کر دے گا۔ (فروع الکافی، جلد 3، حدیث 4672، http://www.almurtadha.org)

اہل تشیع کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے مگر واقعہ کربلا پر رونا اور ماتم کرنا اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہی نوحہ اور ماتم برا ہے جو انسان کی اپنی تکلیف پر ہو۔ واقعہ کربلا پر رونا، نوحہ کرنا اور اس پر ماتم کرنا اس حکم سے مستثنیٰ ہے کیونکہ یہ اہل بیت کی تکالیف پر ہے۔ وہ اس استثنا کے حق میں اپنی کتب سے متعدد احادیث پیش کرتے ہیں۔

ماتم کے جواز میں اہل تشیع کے دلائل

ماتم کے جواز میں اہل تشیع قرآن مجید اور اہل سنت کی کتب کی بعض احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

1۔ قرآن مجید میں ہے کہ جب فرشتوں نے سیدنا ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کو بیٹے کی بشارت دی تو ان کی اہلیہ سیدہ سارہ رضی اللہ عنہا ہنس پڑیں اور انہوں نے اپنا چہرہ پیٹا۔ اہل تشیع کہتے ہیں کہ اس سے چہرہ پیٹنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اہل سنت اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس کا نوحہ یا ماتم سے کوئی تعلق نہیں۔ چونکہ سیدہ سارہ بوڑھی تھیں، اس وجہ سے بچے کی پیدائش کا سن کر وہ انتہائی حیرت زدہ ہوئیں اور بے اختیار ماتھے پر ہاتھ مارا جیسا کہ بڑی بوڑھیوں کا انداز ہوا کرتا ہے۔

2۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کو تہجد کے وقت اٹھایا اور اس پر کچھ تنبیہ فرمائی تو انہوں نے کہا: "یا رسول اللہ! ہماری روحیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، وہ جب ہمیں اٹھانا چاہتا ہے، اٹھا دیتا ہے۔" اس پر آپ نے اپنے زانوئے مبارک پر ہاتھ مار کر فرمایا: "انسان ہر مخلوق سے زیادہ بحث کرنے والا ہے۔" اہل تشیع کہتے ہیں کہ اس سے جسم کو پیٹنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں بھی اہل سنت کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور تنبیہ ایسا کیا، یہ کوئی ماتم

یا نوحہ نہ تھا اور نہ ہی غم اور سوگ منانے کا موقع و محل تھا۔

3۔ موطاء امام مالک میں سعید بن مسیب رحمہ اللہ کی ایک روایت کے مطابق ایک اعرابی سے روزہ ٹوٹ گیا۔ وہ اس پر اتنے غمزدہ ہوئے کہ سینہ پیٹتے اور بال نوچتے ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ روایت مرسل (یعنی جس میں صحابی کا نام ذکر نہ کیا گیا ہو) ہے جو کہ ضعیف اور قابل حجت نہیں ہوتی۔ یہی واقعہ بخاری و مسلم میں بھی درج ہے مگر وہاں سینہ پیٹنے اور بال نوچنے کا ذکر نہیں ہے۔ اس روایت میں موقع و محل سوگ کا نہیں ہے بلکہ ان صاحب سے ایک غلطی ہو گئی جس پر انہوں نے نادم ہو کر ایسا کیا۔

4۔ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب انہیں یہ خبر ملی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک جنگ احد میں شہید ہو گئے ہیں تو انہوں نے اپنے بتیس کے بتیس دانت توڑ ڈالے۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ روایت کسی معتبر سند کے ساتھ کسی کتاب میں درج نہیں ہے۔ اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی طرح یہ واقعہ ثابت ہو بھی جائے تو بھی اس سے ماتم کا جواز ثابت نہیں ہوتا ہے کیونکہ حضرت اویس قرنی محض ایک تابعی تھے، صحابی نہیں تھے اور تابعی کا عمل حجت نہیں ہے۔

5۔ جنگ احد میں سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افسوس! حمزہ کو رونے والا اور ان پر نوحہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس کے جواب میں اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ روایت صرف طبقات ابن سعد میں بغیر کسی سند کے آئی ہے جس کی وجہ سے یہ قابل استدلال نہیں ہے۔ طبقات ابن سعد حدیث کی نہیں بلکہ مختلف لوگوں کے محض حالات زندگی کی کتاب ہے جس میں اس درجے کی احتیاط نہیں کی گئی جیسا کہ کتب حدیث میں ہوتی ہے۔ ابن ماجہ میں یہی روایت موجود ہے مگر اس میں صرف رونے کا ذکر ہے، جس کے جواز کے وہ بھی قائل ہیں۔ نوحہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ابن ماجہ ہی کی ایک اور روایت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اظہار افسوس کے لیے یہ کہہ دیا تھا کہ حمزہ کو رونے والا کوئی نہیں ہے۔ اس پر انصار کی خواتین نے رونا شروع کیا تو آپ نے انہیں منع فرما دیا ہے۔ روایت یہ ہے:

عن سهل بن زياد، عن أحمد بن محمد بن أبي نصر، والحسن ابن علي جميعا، عن أبي جميلة، عن حَدَّثَنَا هَارُونُ بْنُ سَعِيدٍ الْمِصْرِيُّ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ وَهْبٍ أَنْبَأَنَا أُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِنِسَاءِ عَبْدِ الْأَشْهَلِ يَبْكِينَ هَلْكَاهُنَّ يَوْمَ أُحُدٍ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَكِنَّ حَمْزَةَ لَا بَوَاكِيَ لَهُ فَجَاءَ نِسَاءُ الْأَنْصَارِ يَبْكِينَ حَمْزَةَ فَاسْتَيْقَظَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ وَيْحَهُنَّ مَا انْقَلَبْنَ بَعْدُ مُرُوهُنَّ فَلْيَنْقَلِبْنَ وَلَا يَبْكِينَ عَلَى هَالِكٍ بَعْدَ الْيَوْمِ.

ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو عبد الاشہل کی خواتین کے پاس سے گزرے جو جنگ احد کے شہدا پر رو رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا: "حمزہ پر رونے والی کوئی نہیں ہے۔" انصار کی خواتین آئیں اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر رونے لگیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو فرمایا: "ان پر افسوس ہے، یہ واپس نہیں گئیں۔ ان سے کہو کہ واپس چلی جائیں اور آج کے بعد کسی مرنے والے پر نہ

روئیں۔" (سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث 1591)

6۔ تاریخ کی کتب جیسے البدایہ والنہایہ اور طبری وغیرہ سے اہل تشیع ایسے متعدد واقعات پیش کرتے ہیں جن میں بعض صحابیات کے ماتم کرنے کا ذکر ہے۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ سب روایتیں ابو مخنف لوط بن یحیی کی روایت کردہ ہیں جو کہ غالی شیعہ راوی تھے۔ اس وجہ سے یہ روایات مستند نہیں ہیں۔

باغ فدک

باغ فدک ایک تاریخی مسئلہ ہے جس کی ایک دینی جہت بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ اپنا مکمل وقت دعوت و تبلیغ اور حکومت کے معاملات میں صرف کیا کرتے تھے، اس وجہ سے آپ کے پاس اتنا وقت نہ بچتا تھا جس سے آپ تجارت وغیرہ کر کے اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کر سکیں۔ جب خیبر فتح ہوا تو وہاں کا ایک باغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اہل بیت کی ضروریات کے لیے وقف کر دیا گیا۔ اسے باغ فدک کہا جاتا ہے۔ اس کی آمدنی سے آپ اپنے گھرانے کے اخراجات پورے کرتے اور مدینہ کے دیگر ضرورتمندوں کی کفالت کیا کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس باغ کو بطور ترکہ تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی ہے بلکہ ان کی میراث صرف علم ہوا کرتا ہے۔ یہ باغ حکومت کی ملکیت تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت نہ تھا، اس وجہ سے اس باغ کو بطور وراثت تقسیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس باغ کی بطور ٹرسٹ حیثیت برقرار رکھی اور اس کا انتظام سیدنا علی اور عباس رضی اللہ عنہما کے سپرد کر دیا تا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت کی ضروریات کا اہتمام کر سکیں۔

اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین یہاں تک تو یہ قصہ ایسے ہی بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کے ہاں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اہل تشیع کا کہنا یہ ہے کہ انبیاء کی وراثت بھی تقسیم ہوتی ہے۔ یہ باغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت تھا اور اسے تقسیم کیا جانا چاہیے تھا۔ ایسا نہ کر کے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے درست نہیں کیا اور سیدہ کا حق غصب کیا جس کی وجہ سے آپ اپنی وفات تک ان سے ناراض رہیں اور وصیت فرمائی کہ میرا جنازہ کوئی نہ پڑھے۔

اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عین شریعت کے مطابق فیصلہ کیا اور کسی کا حق غصب نہیں کیا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو شروع میں کچھ کبیدگی ہوئی مگر اس کے بعد وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فیصلے سے مطمئن ہو گئی تھیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں بھی فدک کو اپنی ذاتی تحویل میں نہیں لیا۔ دونوں گروہ اپنے اپنے نظریے کے حق میں روایات پیش کرتے ہیں۔

یہ تو اس مسئلے کا تاریخی پہلو ہے۔ اس سے ایک دینی مسئلہ بھی جنم لیتا ہے۔ اہل تشیع کے نزدیک انبیاء کرام کی وراثت تقسیم ہونی چاہیے۔ نہ صرف اموال بلکہ حکومت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وراثت تھی جو کہ آپ کے اہل بیت کا حق تھا۔ اس کے برعکس اہل سنت کا کہنا یہ ہے کہ اول تو انبیاء کی وراثت صرف علم ہوتا ہے، وہ مال و دولت ترکے میں نہیں چھوڑا کرتے۔ ان کے پاس اگر کچھ مال ہوتا بھی ہے تو وہ امت کے لیے وقف ہوتا ہے۔ رہی حکومت تو اسلام میں یہ عام لوگوں کا حق ہے کہ ان کے مشورے سے حکمران کا انتخاب کیا جائے۔ یہ ملوکیت نہیں ہے جس میں حکومت بھی بطور وراثت اگلی نسل کو منتقل ہو جاتی ہے۔

اہل تشیع اور اہل سنت دونوں کا نقطہ نظر اپنی اپنی روایات کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس ضمن میں اہل تشیع قرآن مجید کی ایک آیت بھی پیش کرتے ہیں جو یہ ہے:

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُودَ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ.

سلیمان داؤد کے وارث ہوئے تو انہوں نے کہا: "اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر چیز عطا کی گئی ہے۔ یہ تو واضح طور پر (اللہ کا) فضل ہے۔" (النمل 27:16)

اہل تشیع کا کہنا یہ ہے کہ اس آیت سے واضح ہے کہ سیدنا سلیمان علیہ الصلوۃ والسلام کو سیدنا داؤد علیہ الصلوۃ والسلام کی وراثت کے طور پر حکومت ملی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے ہاں بھی وراثت چلتی ہے۔ اہل سنت کا نقطہ نظر مختلف ہے۔ ان کے ہاں انبیاء کی وراثت مال و دولت میں نہیں بلکہ علم و نبوت میں ہوتی ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ یہاں اسی وراثت کا ذکر ہے۔ رہا حکومت کا معاملہ تو سیدنا داؤد علیہ الصلوۃ والسلام کے خاندان میں ملوکیت خود بنی اسرائیل کی درخواست پر رکھی گئی تھی ورنہ اس سے پہلے ان کے ہاں "قضاۃ" کی صورت میں ایک جمہوری نظام رائج تھا جس کی تفصیل بائبل کی کتاب "قضاۃ (Judges)" میں ملتی ہے۔ اس نقطہ نظر کے حق میں اہل سنت اہل تشیع کی کتب سے یہ دلیل پیش کرتے ہیں:

عن سهل بن زياد، عن أحمد بن محمد بن أبي نصر، والحسن ابن علي جميعا، عن أبي جميلة، عن محمد بن يحيى، عن أحمد بن محمد بن عيسى، عن محمد بن خالد، عن أبي البختري، عن أبي عبدالله (عليه السلام) قال: إن العلماء ورثة الانبياء وذاك أن الانبياء لم يورثوا درهما ولا دينارا، وانما اورثوا أحاديث من أحاديثهم، فمن أخذ بشئ منها فقد أخذ حظا وافرا، فانظروا علمكم هذا عمن تأخذونه؟ فإن فينا أهل البيت في كل خلف عدولا ينفون عنه تحريف الغالين، وانتحال المبطلين، وتأويل الجاهلين.

ابو عبد اللہ علیہ السلام نے فرمایا: "یقیناً علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہا وہ انبیاء کی وراثت میں درہم و دینار نہیں پاتے ہیں بلکہ ان کی احادیث میں سے احادیث کی وارثت حاصل کرتے ہیں۔ تو جو کوئی ان میں سے کچھ اخذ کر لے، اسے وافر حصہ ملا۔ تو اپنے علم کی جانب دیکھو کہ تم اسے ان سے کیسے حاصل کرتے ہو؟ یقیناً ہم میں اہل بیت ہیں جو غلو کرنے والوں کی تحریف، باطل کی پیروی کرنے والوں کی نقل، اور جاہلوں کی

تاویلات کی نفی کرتے ہیں۔(اصول الکافی، کتاب فضل العلم)

أحمد بن إدريس، عن محمد بن عبدالجبار، عن صفوان بن يحيى، عن شعيب الحداد، عن ضريس الكناسي قال: كنت عند أبي عبدالله (عليه السلام) وعنده أبوبصير فقال أبوعبدالله (عليه السلام): إن داود ورث علم الانبياء، وإن سليمان ورث داود، وإن محمدا (صلى الله عليه وآله) ورث سليمان، وإنا ورثنا محمدا (صلى الله عليه وآله) وإن عندنا صحف إبراهيم وألواح موسى، فقال أبوبصير: إن هذا لهو العلم، فقال: يا أبا محمد ليس هذا هو العلم، إنما العلم ما يحدث بالليل والنهار، يوما بيوم وساعة بساعة.

ضریس الکناسی کہتے ہیں کہ میں ابو عبد اللہ علیہ السلام کے پاس تھا اور ان کے پاس ابو بصیر بھی تھے۔ ابو عبد اللہ نے فرمایا: "یقیناً داؤد علیہ السلام کو انبیاء کے علم کا ورثہ ملا۔ پھر سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے۔ یقیناً محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلیمان علیہ السلام کے وارث ہیں اور آپ کے وارث ہم ہیں۔ ہمارے پاس ابراہیم علیہ السلام کے صحائف اور موسی علیہ السلام کی تختیاں ہیں۔" ابو بصیر نے کہا: "کیا یہی علم ہے؟" فرمایا: "ابو محمد! یہ وہ علم نہیں ہے۔ علم تو بس وہ ہے جو دن ورات بیان کرتے ہیں، دن بدن، گھڑی بہ گھڑی۔(اصول الکافی، کتاب فضل العلم، باب أن الائمة ورثوا علم النبي وجميع الانبياء والاوصياء)

اپنے نقطہ نظر کے حق میں اہل تشیع، اہل سنت کی کتاب صحیح بخاری سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں:

حدثنا عبد العزيز بن عبد الله: حدثنا إبراهيم بن سعد، عن صالح، عن ابن شهاب قال: أخبرني عروة بن الزبير: أن عائشة أم المؤمنين رضي الله عنها أخبرته:

أن فاطمة عليها السلام، ابنة رسول الله صلى الله عليه وسلم: سألت أبا بكر الصديق بعد وفاة رسول الله صلى الله عليه وسلم: أن يقسم لها ميراثها، ما ترك رسول الله صلى الله عليه وسلم مما أفاء الله عليه، فقال أبو بكر: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: (لا نورث، ما تركنا صدقة). فغضبت فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم فهجرت أبا بكر، فلم تزل مهاجرته حتى توفيت، وعاشت بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم ستة أشهر.

سیدہ عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ فاطمہ بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی وفات کے بعد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آپ کی میراث تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالی نے بطور فئی (وہ مال غنیمت جو جنگ کے بغیر حاصل ہو) دیا تھا۔ ابو بکر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہمارا (انبیا کا) ورثہ تقسیم نہیں ہوتا ہے، ہم جو چھوڑیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔" فاطمہ رضی اللہ عنہا غضب ناک ہو گئیں اور ابو بکر کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ پھر وہ ان سے اپنی وفات تک نہ ملیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔(بخاری، کتاب خمس، 2926)

اس حدیث میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ناراضی کا ذکر ہے۔ اس سے اہل تشیع استدلال کرتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کی حق تلفی کی اور قرآن مجید کے وراثت سے متعلق احکام کی خلاف ورزی کی۔ ان کا خیال ہے کہ اگر وہ باغ فدک کی وراثت کو تقسیم کر دیتے تو پھر خلافت کی وراثت کو بھی تقسیم کرنا پڑتا۔

اہل سنت اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایسا حدیث پر عمل کرتے ہوئے کیا کہ انبیاء کا مال وراثت میں

تقسیم نہیں ہوتا اور یہ حدیث اہل تشیع کی کتب میں بھی آئی ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر سیدہ رضی اللہ عنہا ناراض ہوئیں تو اس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ان کا قصور تب ہوتا جب وہ باغ فدک پر خود قبضہ کر لیتے۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اسے سرکاری تحویل میں رکھے رکھا اور اس کی آمدنی کو بدستور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت اور غرباء و مساکین پر خرچ کرتے رہے۔

اہل سنت کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اوپر بیان کردہ حدیث میں کچھ الحاق اور اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پیش کی جائے اور وہ اس پر عمل کرنے کی بجائے غضب ناک ہو جائیں۔ اگر انہیں اس حدیث پر یقین نہ تھا تو وہ اس واقعے کے چھ ماہ بعد تک زندہ رہیں، اس دوران وہ دیگر صحابہ سے حدیث کی تحقیق کر سکتی تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے میں راویوں نے اپنی جانب سے کچھ الحاق اور اضافہ کر دیا ہے۔ یہ حضرات اس کے لیے ابن شہاب زہری کا نام لیتے ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ صاحب اہل تشیع میں سے تھے یا کم از کم ان کے خیالات سے متاثر تھے۔

اہل سنت مزید یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر واقعتاً سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے باغ فدک کو تقسیم نہ کر کے قرآن کے قانون وراثت کی خلاف ورزی کی تھی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اس جائیداد کو بطور وراثت تقسیم کیوں نہیں کیا؟ رہا سوال سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نیت کا تو اہل سنت کہتے ہیں کہ دلوں کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر وہ آج کل کے حکمرانوں جیسے ہوتے اور محض اقتدار کو بچانے کے لیے فدک کو انہوں نے وراثت میں تقسیم نہ کیا تو مفاد پرستانہ سیاست کے نقطہ نظر سے بھی یہ فیصلہ درست نہ تھا۔ اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی معاذ اللہ مفاد پرست سیاست دان ہوتے تو باآسانی یہ مال بطور سیاسی رشوت دے کر اپنی خلافت کو مستحکم کر لیتے۔ اہل سنت کے نزدیک ایسا تصور کرنا نہ صرف صحابہ کرام بلکہ اہل بیت اطہار اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہم سبھی کی کردار کشی کے مترادف ہے۔

اہل سنت کے نزدیک انبیاء کرام کی وراثت کے تقسیم نہ ہونے کی حکمت یہ ہے کہ کوئی ان پر اقربا پروری اور کرپشن کا الزام نہ لگا سکے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے گرد جو لوگ اکٹھے ہوتے ہیں، وہ نہ تو خود ان سے کوئی مادی فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ اپنے رشتے داروں کو ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جھوٹے نبی اور مذہبی راہنما، اپنے پیروؤں سے بھرپور مالی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ سید ابو الحسن علی ندوی (1913-1999) لکھتے ہیں:

> اس داعی دین، مرسل من اللہ اور حامل رسالت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بانیان سلطنت، فاتحین و کشور کشاؤں، سیاسی قائدین و رہنماؤں سے اپنے مزاج و مذاق [Taste]، کردار و عمل اور مقاصد و نتائج میں نہ صرف کھلا امتیاز رکھتا ہو، بلکہ اس میں اور اس گروہ میں بین تباین [Open contrast] اور تضاد پایا جاتا ہو۔ بانیان سلطنت، فاتحین ممالک، دنیا کے حوصلہ مدن اور طالع آزما رہنماؤں کی کوششوں کا محور اور جدوجہد کا

مقصد اعلی یا کم سے کم قدرتی ولازمی نتیجہ خاندانی سلطنت کا قیام اور موروثی حکومت کی تاسیس ہوتی ہے، اور یہ سلسلہ (جیسے کہ رومی، بازنطینی، ساسانی، کیانی، سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں کے عروج واقبال کی تاریخ بتاتی ہے) صدیوں تک چلتا ہے۔ اگر کسی غیر معمولی سبب کی وجہ سے یہ نہیں ہو سکتا تو کم سے کم درجہ یہ ہے کہ ان بانیان سلطنت اور فاتحین کشور کشاؤں اور ان سیاسی رہنماؤں کے (جو اپنی تحریک میں کامیاب ہوئے) خاندان، فراواں دولت اور وسیع اسباب عیش و عشرت کے مالک بن جاتے ہیں۔ وہ اردو مثل کے مطابق "دودھوں نہاتے اور پوتوں پھلتے ہیں" اور سونے اور چاندی کے جھولوں میں جھولتے ہیں، گویا جنگل میں ایک شیر شکار کرتا ہے، اور سینکڑوں جانور کھاتے ہیں۔۔۔

اس کے برخلاف خدا کا پیغمبر نہ کسی خاندانی سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے، نہ اپنے خاندان کے مفادات کا تحفظ اور ان کے لیے عرصہ دراز تک عیش و عشرت کے امکانات و مواقع کا انتظام کر جاتا ہے، جن کی بدولت وامت کے دوسرے طبقات کے مقابلہ میں زیادہ مرفہ الحالی اور فارغ البالی کی زندگی گزار سکیں۔ بلکہ اس کا معاملہ ان کے ساتھ برعکس ہوتا ہے، اور وہ اس کی زندگی میں بھی دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ زہد و قناعت، ایثار و قربانی اور عسرت و جفاکشی کی زندگی گزارتے ہیں، اور اس کے بعد ان کو اپنی ذاتی صلاحیتوں اور جدوجہد پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، اور وہ برہمنوں اور پروہتوں یا کسی مقدس نسل وخاندان کی طرح مفت خور اور تن آسان نہیں رہ سکتے۔[2]

آپ [صلی اللہ علیہ وسلم] کا معاملہ اپنے اہل بیت اور قرابت داروں کے ساتھ (الاقرب فالاقرب) دنیادی سرداروں، نسب پرستوں، عام حکمرانوں سے نہ صرف مختلف بلکہ متضاد تھا، آپ کا اصول یہ تھا کہ جو آپ سے جس قدر قریب ہوتا، آپ خطرات اور آزمائشوں میں اس کو اسی قدر آگے رکھتے، اور انعام واکرام اور مال غنیمت کی تقسیم کے وقت اسی قدر پیچھے۔ جب عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ نے (جو عرب کے نامی گرامی بہادروں اور جنگ آزماؤں میں تھے) بدر کے معرکہ میں قریش کو للکارا اور مبارز طلبی کی، تو آپ نے حمزہ، علی، عبیدہ [رضی اللہ عنہم] کو آواز دی، ان کے مقابلہ میں بھیجا، حالانکہ آپ مکہ کے ان شہسواروں کی حیثیت سے خوب واقف تھے۔۔۔ لیکن آپ نے جب زکوۃ کی فرضیت کا اعلان کیا (جو قیامت تک باقی رہنے والا اسلامی رکن ایک دائمی وعالمگیر ادارہ (Institution) اور آمدنی کا غیر مختتم [Ceaseless] ذریعہ ہے) تو بنی ہاشم کو اس سے فائدہ اٹھانے سے قیامت تک کے لیے روک دیا اور ان کا اس میں کوئی حصہ نہیں رکھا۔ لیکن جب سود کو حرام قرار دیا تو اس کی ابتدا اپنے عم محترم عباس ابن عبد المطلب سے کی۔[3]

اہل سنت کا کہنا یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا یہی وہ کردار ہے جس کی بنیاد پر اس بات کا فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ سچے نبی ہیں۔ اس کے برعکس نبوت کے جھوٹے دعوے داروں کی اولاد کو دیکھیے تو وہ فی الواقع اپنے جد اعلی کے پیروکاروں کے مال پر پل رہے ہوتے ہیں۔

اسائن منٹس

1. باغ فدک پر اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین کس امر پر اختلاف ہوا اور ان دونوں کے دلائل کیا تھے؟
2. ماتم کے جواز کے حق میں اور اس کے خلاف دو دو دلائل دیجیے۔
3. کیا ماتم کرنا صبر کے منافی نہیں ہے؟ اس معاملے میں اہل تشیع اور اہل سنت کا موقف کیا ہے؟

تعمیر شخصیت

چھوٹے چھوٹے اختلافی مسائل میں الجھنا اور دین کے بڑے بڑے احکامات کو نظر انداز کرنا ایک غیر متوازن رویہ ہے۔

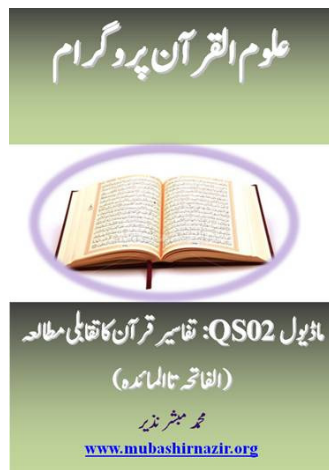

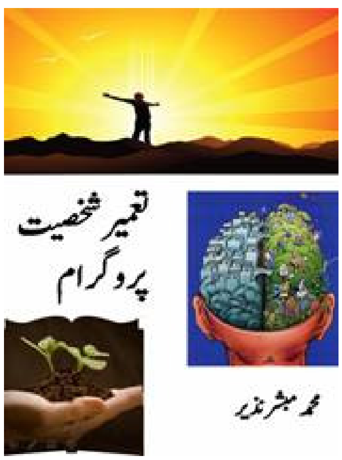

[1] مجالس فاخرہ، سید عبد الحسین شرف الدین

[2] دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں، باب عالمگیر اور دائمی دین کے لیے چار شرطیں

[3] حوالہ بالا، باب خطرات میں آگے، منافع میں پیچھے

سبق 9: اہل تشیع کے ذیلی فرقے

اس سبق میں ہم اہل تشیع کے ذیلی فرقوں کا مطالعہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ مختلف معاملات میں ان کے نقطہ ہائے نظر میں کیا فرق ہے۔

اہل تشیع میں تقسیم کا عمل ابتدائی صدیوں ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ اس کی اصل بنیاد عقیدہ امامت تھی۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ اہل تشیع کے نزدیک عقیدہ امامت دین کے اساسی عقائد میں سے ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے کچھ لوگوں کو امامت کے منصب پر فائز کرتا ہے جو کہ اللہ تعالی سے براہ راست ہدایت حاصل کر کے لوگوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام کا تعین کیسے کیا جائے گا؟ اہل تشیع کے نزدیک یہ تعین اللہ تعالی کی جانب سے ہوتا ہے۔ کوئی شخص امام کا تعین نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالی کی جانب سے اطلاع ملنے پر ایک امام اپنے وفات سے پہلے اگلے امام کے بارے میں اعلان کر دیتا ہے۔ تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ اس اطلاع کے بارے میں اختلاف ہو گیا جس کے نتیجے میں دو حضرات کو امام مان لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کے پیروکار بعد میں مستقل فرقوں کی صورت اختیار کرتے چلے گئے۔ یہاں ہم علی حسین رضوی صاحب کی کتاب "تاریخ شیعان علی" سے ان فرقوں کی تفصیل پیش کرتے ہیں جو انہوں نے "مسلک امامیہ کے ذیلی فرقے" کے عنوان کے تحت بیان کی ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلا اختلاف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہوا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ان کے دو بیٹے حسن و حسین رضی اللہ عنہما تھے جنہیں شیعہ حضرات بالاتفاق دوسرے اور تیسرے امام مانتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بیویوں سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعدد بیٹے تھے۔ واقعہ کربلا کے بعد اولاد علی کی قیادت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ (16-81/637-700) کے سپرد ہوئی۔ وہ بنو امیہ کے حکومت کو تسلیم کرتے تھے اور انہوں نے اپنے بڑے بھائی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو کربلا جانے سے روکا تھا۔ ان کے آزاد کردہ غلام کیسان نے ان کی امامت کا اعلان کر دیا اور ان کے بعد ان کے بیٹے ابو الہاشم کو امام مان لیا۔ یہ فرقہ "کیسانیہ" کہلایا جو کہ آگے چل کر بنو عباس کی تحریک میں ضم ہو گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابو الہاشم بنو فاطمہ (یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہ اولاد جو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا میں سے تھی) کی امامت کی دعوت دیا کرتے تھے۔

دوسرا فرقہ "زیدیہ" تھا۔ حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ (38-95/659-712)، جو کہ زین العابدین کے لقب سے مشہور ہیں، چوتھے امام سمجھے جاتے ہیں۔ واقعہ کربلا کے بعد انہوں نے بنو امیہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد یہ اختلاف پیدا ہوا کہ امامت ان کے بیٹے زید (75-122/695-740) کو منتقل ہوئی یا محمد باقر (57-114/676-733) کو۔ حضرت زید رحمہ اللہ کے ماننے والے "زیدیہ" کہلائے۔ یہ شیعہ مکاتب فکر میں اہل سنت کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ اس وقت یمن میں انہی کی اکثریت ہے اور یہ

آبادی کا 40-50% ہیں۔ اس کے علاوہ عمان اور سعودی عرب میں یہ اقلیت میں موجود ہیں۔

تیسرا فرقہ "عباسی" تھے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ (566-654/32H) کی اولاد میں سے تھے۔ شروع میں انہوں نے نفس زکیہ (d. 144/762) کے ہاتھ پر بیعت کر کے بنو فاطمہ کی خلافت کا اعلان کیا اور بنو امیہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت کامیاب ہو گئی جس کے نتیجے میں بنو عباس اقتدار میں آئے۔ اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے بنو فاطمہ کی بجائے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ یہ لوگ زیادہ تر اہل سنت سے تعلق رکھتے تھے مگر بنو فاطمہ کی خلافت کی حمایت کی وجہ سے بعض حضرات ان کا شمار بھی اہل تشیع میں کرتے ہیں۔ عباسی بادشاہ مامون الرشید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے بعد ائمہ اہل بیت کے آٹھویں امام رضا بن موسی کاظم رحمہا اللہ (153-203/765-818) کو خلیفہ نامزد کیا تھا مگر آپ کی وفات مامون سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔

چوتھا فرقہ اسماعیلیوں کا تھا جو کہ امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ (83-148/702-765) کی وفات کے بعد بنا۔ ان کے بھی دو بیٹے تھے: بڑے بیٹے کا نام اسماعیل (103-138/721-755) تھا جبکہ چھوٹے بیٹے موسی کاظم (128-183/745-799) کہلاتے تھے۔ اسماعیل اپنے والد جعفر صادق کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے۔ ان کے بعد ایک گروہ نے موسی کاظم کو امام مانا اور دوسرے نے اسماعیل کے بیٹے محمد کو۔ یہ دوسرا گروہ اسماعیلی کہلایا۔ یہ لوگ اب بھی موجود ہیں۔ ان کے دو گروہ ہیں، ایک بوہری اور دوسرے آغا خانی کہلاتے ہیں۔ بوہری زیادہ تر بھارت کے صوبہ مہاراشٹر اور گجرات اور پاکستان میں کراچی میں پائے جاتے ہیں۔ آغا خانی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں جبکہ پاکستان کے شمالی علاقوں گلگت، ہنزہ اور اسکردو میں ان کی آبادی اکثریت پر مشتمل ہے۔ اسماعیلیوں کی ایک شاخ لبنان میں "دروز" کے نام سے مشہور ہے اور اہل تشیع ہی کی ایک اور شاخ "علوی" ترکی، شام اور لبنان میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

ان فرقوں کے پیدا ہونے کے اسباب سے متعلق شیعہ مورخ علی حسین رضوی لکھتے ہیں:

> ان فرقوں کے وجود میں آنے کا بنیادی نکتہ اقتدار تھا مگر ختم المرسلین کے نائب برحق نے امامت کے لئے جو خدائی منشور دیا تھا، اس میں اقتدار کے لئے تلوار اٹھانے کی گنجائش ہی نہ تھی لیکن خانوادہ رسالت پر ستم رانی کا سلسلہ بند ہونے کو نہ آتا تھا۔ انجام کار بعض جوانوں کی رگوں میں خون اس تیزی سے دوڑنے لگتا کہ ہاتھ خود بخود قبضہ شمشیر پر پہنچ جاتا، وہ اجازت طلبی کی نگاہ سے بزرگوں کی طرف دیکھنے لگتے، کوئی ہمت افزائی نہ ہوتی تو تلملا کر رہ جاتے اور اندر کی گھٹن انہیں چین لینے نہ دیتی۔[1]

ان تمام مکاتب فکر کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کی اپنی کتب دستیاب نہیں ہیں۔ زیادہ تر مواد وہ ہے جو ان کے مخالفین نے ان کی جانب منسوب کیا ہے۔ اس مواد کو بیان کرنا اس لیے مناسب نہ ہو گا کہ مخالفین کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ چن چن کر ایسا مواد اپنی کتب میں اکٹھا کرتے ہیں جس سے مخالف فرقے کو بدنام کیا جا سکے۔ ہم کوشش کریں گے کہ یہاں وہی مواد پیش کریں جو یا تو اس فرقے کی اپنی مستند کتب سے ہو یا پھر غیر جانبدار ذرائع جیسے غیر مسلم مستشرقین کی جانب سے فراہم کیا گیا ہو۔ اگلے صفحے پر ایک چارٹ پیش کیا جا رہا ہے جو کہ

اہل تشیع کے مختلف فرقوں اور ان کے ائمہ کو بیان کرتا ہے۔ تفصیل یہ ہے:

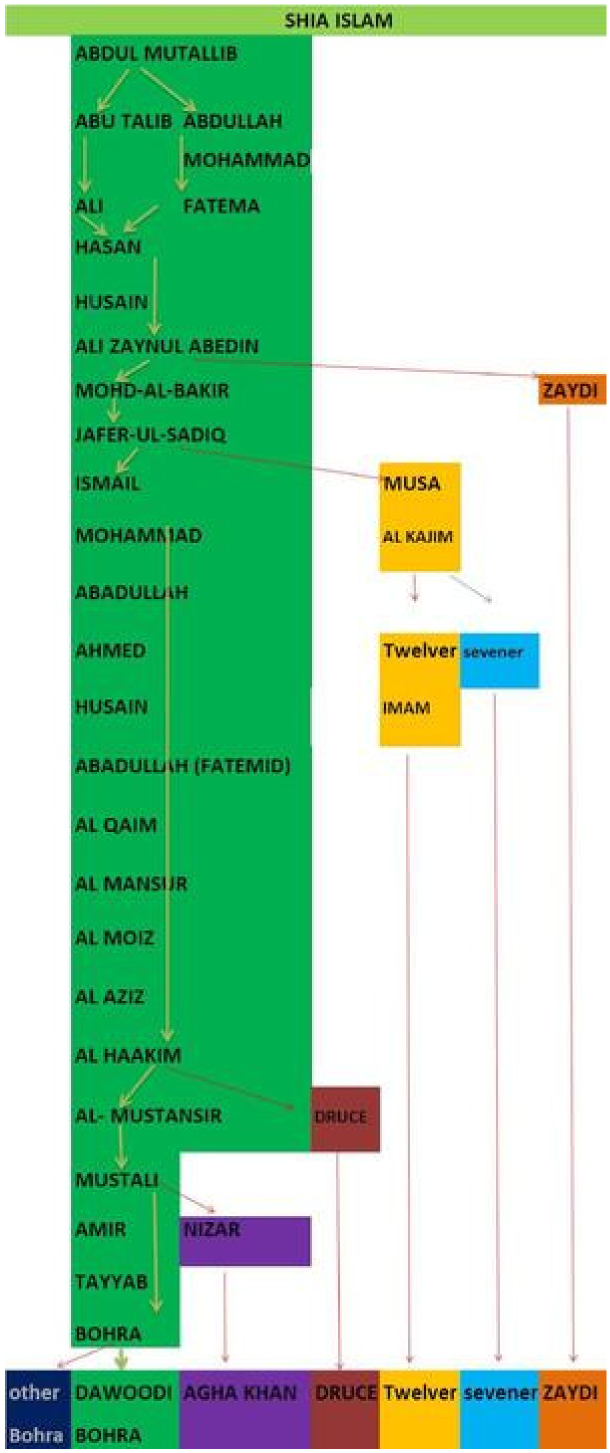

بشکریہ www.wikipedia.org

اثنا عشریہ

اہل تشیع کا سب سے بڑا فرقہ اثنا عشریوں کا ہے۔ یہ 12 ائمہ کو مانتے ہیں۔ انہی کی تفصیل ہم اس کتاب میں بیان کرتے آ رہے ہیں۔ اس سبق میں ہم ان کی بجائے دیگر شیعہ فرقوں اور ان کے اثنا عشریوں سے اختلافات کا مطالعہ کریں گے۔

زیدیہ

زیدیہ اس وقت بھی موجود ہیں اور یمن میں ان کی اکثریت ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ عمان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ شیعہ حضرات کے ذیلی فرقوں میں یہ اہل سنت سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ قرون وسطی کے کلامی مکاتب فکر میں زیدی معتزلہ کے زیادہ قریب ہیں۔ یہاں ہم ان کا نقطہ نظر چوتھی صدی ہجری کے ایک بڑے زیدی عالم، عباد بن صاحب (326-385/937-995) کی عربی کتاب "الزیدیہ" سے بیان کر رہے ہیں۔

زیدیوں کے عقائد

زیدیوں کے نزدیک امامت ایک منصب ہے جو امت کے افضل ترین آدمی کو ملنا چاہیے۔ ان کے نزدیک عہد صحابہ میں سب سے افضل سیدنا علی رضی اللہ عنہ تھے، اور یہ منصب ان کا حق تھا۔ تاہم کسی وجہ، جسے وہ "علت" کہتے ہیں، سے یہ منصب افضل ترین انسان کی بجائے کسی اور کو دیا جا سکتا ہے۔ اس استدلال کی روشنی میں زیدیوں کے نزدیک سیدنا ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافت درست تھی کیونکہ ان کی خلافت کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے تسلیم کر لیا تھا۔ سیدنا علی کے بعد زیدی حضرات حسن و حسین اور ان کے بیٹے علی زین العابدین (38-95/659-712) رضی اللہ عنہم کو امام تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے بعد اگلا امام وہ امام محمد باقر (57-114/676-733) کی بجائے ان کے بھائی زید بن علی (75-122/695-740) کو مانتے ہیں اور انہی کی نسبت سے زیدی کہلاتے ہیں۔ اس طرح زیدی اہل تشیع کے ائمہ میں سے چار کو امام مانتے ہیں مگر پانچویں امام سے ان کا سلسلہ الگ ہو جاتا ہے۔ اثنا عشری شیعوں کے باقی ائمہ کا بھی وہ احترام کرتے ہیں۔ اسی طرح اہل سنت اور اثنا عشری شیعہ امام زید بن علی رحمہ اللہ کا احترام کرتے ہیں۔

اثنا عشری شیعہ کے برعکس زیدیوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ امام کا معصوم ہونا ضروری نہیں ہے۔ ان کے نزدیک امامت وراثت میں منتقل نہیں ہوتی ہے بلکہ نص شرعی سے ثابت ہوتی ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو امامت کا منصب اس لیے ملا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے حق میں اس کی وصیت کی تھی۔ اگر کسی شخص کے امام ہونے کے بارے میں نص شرعی نہ ہو تو امامت دعوت کے ذریعے بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس شخص میں امامت کے اوصاف اکٹھے ہو جائیں، وہ اپنی امامت کی دعوت دے دے تو اس کی امامت ثابت ہو جاتی ہے۔ امامت کے اوصاف میں یہ شامل ہے کہ امام مرد، عاقل، بالغ، مسلمان ہو اور سیاسی امور کا علم

رکھتا ہو۔ وہ عادل، بہادر، بردبار، سخی ہو اور معاشرے میں ذلت کی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا ہو۔ سرکاری مال کو درست جگہ پر خرچ کرنے والا ہو اور جسمانی و عقلی عیوب جیسے اندھاپن، خوف کا مریض ہونا وغیرہ سے پاک ہو۔

امام ایک وقت میں ایک ہی شخص ہو سکتا ہے۔ جس شخص تک امام کی دعوت پہنچ جائے، اس کے لئے لازم ہے کہ وہ دامے درمے قدمے سخنے امام کی نصرت اور مدد کے لئے تیار ہو جائے۔ زیدی غائب امام کے عقیدے پر یقین نہیں رکھتے، ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ امام کو زندہ اور موجود ہونا چاہیے۔ [2]

فقہی معاملات میں زیدی نقطہ نظر، اہل سنت کے حنفی مکتب فکر کے قریب ہے۔

زیدیوں کی تاریخ

زید بن علی(75-122/695-740) نے بنو امیہ کے خلاف بغاوت کی اور اس میں جاں بحق ہوئے۔ یہ خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے نہیں بلکہ پڑپوتے تھے۔ آپ حضرت علی زین العابدین رحمہ اللہ کے بیٹے تھے۔ ان کے بعد زیدی مسلک کے داعی کام کرتے رہے۔ بالآخر تیسری صدی ہجری یا نویں صدی عیسوی میں ان کی دو حکومتیں قائم ہوئیں۔ ایک طبرستان کے علاقے میں جو موجودہ شمالی ایران میں بحیرہ کیسپین کے جنوب میں ہے اور دوسری یمن میں۔ یہ حکومتیں "امامت" کہلاتی تھیں۔ طبرستان والی امامت چھٹی صدی ہجری یا بارہویں صدی عیسوی تک قائم رہی۔ اس کے بعد اسے زوال آیا۔ اس کے بعد یہاں کے اکثر زیدی اثنا عشری شیعوں میں ضم ہو گئے۔

یمن کی زیدی امامت 890 میں قائم ہوئی اور 1595 تک برقرار رہی۔ اس کے بعد ترکی کی سلطنت عثمانیہ نے یمن پر قبضہ کر لیا مگر زیدیوں نے ان کے خلاف بغاوت جاری رکھی اور انہیں 1635 میں نکال باہر کیا۔ اس کے بعد ان کی حکومت مزید دو سو برس تک قائم رہی۔1872 میں پھر عثمانیوں نے یمن کو اپنا صوبہ بنالیا جو کہ پہلی جنگ عظیم تک سلطنت عثمانیہ کا حصہ رہا۔ اس کے بعد یمن آزاد ہوا اور اسے زیدی امامت قرار دیا گیا۔ یہ سلسلہ 1962 تک چلا، جب فوجی بغاوت کے نتیجے میں حکومت کا تختہ الٹ کر اسے سوشلسٹ ریپبلک قرار دے دیا گیا۔ اس وقت سے زیدی امامت کا عہدہ خالی ہے۔ [3]

نزاری یا آغا خانی اسماعیلیہ

اہل تشیع کا تیسرا بڑا فرقہ (بعض کے نزدیک دوسرا بڑا فرقہ) جو آج تک موجود ہے، اسماعیلیہ کہلاتا ہے۔ یہ اپنی نسبت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ (83-148/702-765) کے بیٹے اسماعیل رحمہ اللہ (103-138/721-755) کی جانب کرتے ہیں جو کہ امام صاحب کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے۔ اسماعیلیوں کا کہنا یہ ہے کہ انہوں نے وفات نہیں پائی تھی بلکہ امام جعفر نے انہیں عباسی بادشاہوں سے

محفوظ رکھنے کے لئے چھپا دیا تھا اور ان کے ذریعے خفیہ دعوت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس طریقے سے یہ اہل تشیع کے ائمہ میں سے چھ کو امام مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ امامت باپ سے بیٹے کی جانب منتقل ہوتی ہے نہ کہ بھائی کی طرف۔ اس طریقے سے حضرت اسماعیل کے بعد امامت ان کے بیٹے محمد بن اسماعیل کی جانب منتقل ہوئی نہ کہ ان کے بھائی موسی کاظم رحمہم اللہ (128-183/745-799) کی طرف۔

بعد میں اسماعیلیوں کا یہ گروہ متعدد فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔ ان کے دو گروہوں "قرامطہ" اور "باطنیہ" کو تاریخ میں بڑی شہرت حاصل ہوئی مگر یہ فرقے وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتے گئے۔ موجودہ دور میں اسماعیلیوں کے تین اہم فرقے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک "خوجہ" یا "آغا خانی" کہلاتے ہیں، دوسرے کو "بوہری"، اور تیسرے کو "دروز" کہتے ہیں۔

اثنا عشری شیعہ کے بالکل برعکس اسماعیلی حضرات کے جتنے بھی فرقے ہیں، ان کا مزاج باطنی نوعیت کا ہے۔ ان کے ہاں اپنے مذہب کو چھپایا جاتا ہے اور اس کی کتب عام نہیں کی جاتیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے مذہب کے دروازے دوسرے لوگوں کے لئے بند ہیں بلکہ ان کے ہاں خفیہ دعوت کا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسماعیلیوں کے مختلف فرقوں سے متعلق کتب کی بہت کمی ہے۔ اس معاملے میں جو کتب لکھی گئی ہیں، وہ زیادہ تر ان کے مخالفین کی ہیں جن میں دستیاب معلومات کی تصدیق ایک مشکل کام ہے۔ مخالفین نے ان کے بارے میں بہت سے اوہام اور خرافات منسوب کر دیے ہیں، جن کا ذکر کرنا مناسب نہ ہو گا کیونکہ یہ حقیقت سے بعید باتیں ہیں۔

اس موضوع پر ہمیں لبنان کے اسماعیلی عالم ڈاکٹر شیخ خضر حموی (b. 1929) کی کتاب Introduction to Ismailism ان کی ویب سائٹ www.ismaili.net پر دستیاب ہو گئی ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر یہاں ہم ان کے نقطہ نظر کو پیش کرتے ہیں۔ کچھ معلومات شیخ محمد اکرام صاحب نے اپنی کتاب "آب کوثر" نے فراہم کی ہیں۔ اسماعیلیوں کی دعوت کی تاریخ سے متعلق معلومات مشہور مستشرق ٹی ڈبلیو آرنلڈ (1864-1930) کی کتاب The Preaching of Islam میں ملتی ہیں، یہاں ہم ان کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔

اسماعیلیوں کے بنیادی عقائد اور اعمال

اسماعیلی حضرات کا اثنا عشری شیعوں سے صرف امام کی شخصیت پر ہی اختلاف نہیں ہے بلکہ کچھ اور امور بھی ہیں، جن میں اساسی نوعیت کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ چند تفصیلات یہ ہیں:

اسماعیلی اللہ تعالی کی توحید پر کامل یقین رکھتے ہیں، قرآن و حدیث پر ایمان رکھتے ہیں اور شریعت کو بھی مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک شریعت کی توضیح و تشریح "حاضر امام" کا کام ہے جو شرعی احکام کو منسوخ بھی کر سکتا ہے۔ بعض اسماعیلیوں کے ہاں حلول کا عقیدہ پایا جاتا ہے اور ان میں امام وقت کے بارے میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ خدا ان میں حلول کر جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ امام وقت کے ساتھ عقیدت و محبت کا وہ معاملہ کیا جاتا ہے، جو کہ اہل سنت اور اثنا عشری شیعہ، اللہ تعالی کے ساتھ کرتے ہیں۔ بہت سے اسماعیلی امام

وقت کو رسول یا اس سے کچھ کم کا درجہ دیتے ہیں۔ اس بات پر تمام اسماعیلیوں کا اتفاق ہے کہ زمین پر اللہ کی حجت حاضر امام ہی ہے جو کہ اس معاملے میں فائنل اتھارٹی ہے۔ یہ لامحدود اتھارٹی اسماعیلیوں کے آئین میں بھی دی گئی ہے جو کہ ان کی ویب سائٹ www.ismaili.net پر دستیاب ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات حاضر امام سے دعائیں بھی کرتے ہیں۔ان کے دن کی اختتامی دعا میں کہا جاتا ہے: "یا نور مولانا شاہ کریم الحسینی حاضر امام! تو گت جماعت کی کل مشکل آسان کر۔ تو گت جماعت کے کل گناہ معاف کر۔"

آغا خانی اور دروز کے نزدیک امام وقت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ شریعت کو منسوخ کر دے۔ ہدایت اور راہنمائی کے لیے کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصل راہنمائی زندہ امام کی ہے۔ ان کے فرامین ہی شریعت ہیں۔ اس کے برعکس بوہری حضرات میں مسلمانوں کی مروجہ شریعت کی بڑی حد تک پابندی کی جاتی ہے۔ یہ حضرات نماز نہیں پڑھتے بلکہ اس کی جگہ ان کے ہاں ایک مخصوص انداز میں دعا کی جاتی ہے جس کے لیے وضو کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ہے۔ رمضان کی بجائے شکر وار بیج کا روزہ رکھا جاتا ہے۔ یہ وہ دن ہوتا ہے جب نیا چاند نظر آیا ہو اور جمعہ کا دن ہو۔ زکوۃ کی بجائے آمدنی کا 12.5% آغا خان کو ادا کیا جاتا ہے۔ امام کی زیارت کو حج کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ امام وقت چونکہ کمیونٹی کے روحانی باپ سمجھے جاتے ہیں، اس وجہ سے وہ اپنی جماعت کے اندر شادی نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ جماعت سے باہر ہی شادی کرتے ہیں۔

اسماعیلی عالم، ڈاکٹر خضر حموی بیان کرتے ہیں:

> اسماعیلی کا عمل چار مراحل پر مشتمل ہوتا ہے:
>
> 1۔ شریعت جو کہ قانون ہے۔
>
> 2۔ طریقت جو کہ راستہ ہے۔
>
> 3۔ حقیقت جو کہ سچائی ہے۔
>
> 4۔ معرفت جو کہ علم ہے۔
>
> شریعت کی دو جہتیں ہیں: ایک اسلام یعنی خود کو سپرد کر دینا اور دوسرے امام پر ایمان لانا۔ طریقت کی تین جہتیں ہیں: اطاعت، تبلیغ اور بیعت۔ حقیقت کی جہتیں دو ہیں: امانت اور توحید۔ یہ تمام جہتیں اس دعا کا حصہ ہیں جو دنیا بھر کے اسماعیلی روزانہ پڑھتے ہیں۔[4]

اسماعیلی متعدد فلاحی کاموں، خاص کر وہ جو ان کی اپنی کمیونٹی سے متعلق ہوں، میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان کی ویب سائٹس پر ان فلاحی کاموں کی تفصیلات موجود ہیں۔

اسماعیلیوں کی تاریخ

اہل سنت اور اثنا عشری شیعہ کی نسبت اسماعیلی ابتدائی صدیوں میں دعوت و تبلیغ کے میدان میں بہت متحرک رہے ہیں۔ انہوں نے بہت تیزی سے اپنی خفیہ دعوت کا کام پھیلایا۔ پانچویں صدی ہجری میں ان کے امام مستنصر باللہ (428-487/1036-1095) کے جانشین کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا۔ ایک گروہ نے ان کے بیٹے نزار کو امام مانا اور "نزاری" کہلائے۔ دوسرے گروہ نے ان کے دوسرے بیٹے مستعلی باللہ کو امام مان کر "مستعلویہ" کا لقب اختیار کیا۔ ان کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

نزاریوں کو منظم کرنے والی شخصیت حسن بن صباح (c. 441-517/1050-1124) کی تھی جو کہ "شیخ الجبل" کہلاتے تھے۔ انہوں نے 483/1090 میں شمالی ایران میں قلعہ الموت کو اپنا مرکز بنایا اور اپنے پیروکاروں کو "باطنیہ" کا خطاب دیا۔ باطنیہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ قرآن کے ہر لفظ کے دو معانی ہوتے ہیں، ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ جو مطالب علماء بیان کرتے ہیں، یہ ظاہری ہیں جبکہ باطنی مطالب وہ ہیں جو امام وقت بیان کرتے ہیں۔ جیسے "صلوۃ" کا ظاہری مطلب نماز ہے مگر باطنی مطلب امام کی زیارت ہے۔ اسی طرح "صوم" کا ظاہری معنی روزہ رکھنا ہے مگر باطنی مطلب امام جس سے منع کرے، اس بات سے رکنا ہے۔ اس طریقے سے انہوں نے باطنی مطالب پر مشتمل ایک پورا نظام ایجاد کر لیا۔

حسن بن صباح کو شہرت اپنے خود کش حملہ آوروں سے حاصل ہوئی جو "حشیشین" کہلاتے تھے اور انگریزی لفظ Assassin اسی سے ماخوذ ہے۔ یہ لوگ اپنے امام کے حکم پر جان دے دیا کرتے تھے اور اس کے بدلے میں انہیں جنت کا یقین ہوا کرتا تھا۔ یہ اپنے شکار کو قتل کر کے خودکشی کر لیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حسن بن صباح انہیں حشیش کا عادی بنا کر ہپناٹزم وغیرہ کے ذریعے جنت کا تجربہ کروا دیا کرتے تھے۔ یہ لوگ اہل سنت کی قریبی سلجوق سلطنت کے لیے خطرہ بنے رہے اور ان کے کئی بادشاہ انہی حشیشیوں کا شکار ہوئے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی (reign 569-589/1174-1193) پر بھی ان کے حملوں کا سراغ ملتا ہے۔[5]

نزاریوں ہی کا ایک فرقہ "قرامطہ" تھے جنہوں نے بحرین اور الاحساء (موجودہ سعودی عرب کا مشرقی حصہ) میں اپنی حکومت قائم کر لی اور بغداد کی عباسی سلطنت کے ساتھ مسلسل حالت جنگ میں رہے۔ چوتھی صدی ہجری میں انہیں عروج ملا۔ 318/930 میں انہوں نے مکہ مکرمہ پر حملہ کیا اور حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے اور کئی سال بعد اسے واپس کیا۔ انہی کے ایک گروہ نے سندھ (جو کہ موجودہ سندھ اور پنجاب کے بڑے حصے پر مشتمل تھا) میں اپنی حکومت قائم کر لی اور اپنا مرکز ملتان کو بنایا۔ سلطان محمود غزنوی (reign 387-421/997-1030) نے اپنے حملوں میں اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا جس کے بعد جنوبی ایشیا میں قرامطی فرقہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور اس کے پیروکار اہل سنت یا اثنا عشری شیعوں میں ضم ہو گئے۔

654/1256 میں تاتاریوں کے ہاتھوں ایران میں نزاری اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ ایران میں رہے اور ان کی دعوت کے مراکز بدلتے رہے۔ ان میں فرقے بننے کا عمل جاری رہا اور یہ پھر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے: قاسم شاہی اور محمد شاہی۔ انہوں نے

ہندوستان کو اپنی دعوت کا ہدف بنایا۔ یہاں ان کے دو بڑے مراکز قائم ہوئے۔ ایک صوبہ گجرات میں اور دوسرا شمالی علاقوں میں۔ بقول پروفیسر آرنلڈ کے، گجرات کے داعیوں نے اسلام اور ہندومت کی آمیزش سے اپنی تعلیمات کا مجموعہ تیار کیا جسے "گنان" کہا جاتا ہے۔ نزاری اسماعیلیوں کے مزید داعیوں نے اپنی دعوت و تبلیغ کا مرکز برصغیر کے شمالی علاقوں کو بنایا جس کے نتیجے میں گلگت، چترال، ہنزہ، اسکردو اور چین کے صوبہ سن کیانگ میں ان کی دعوت پھیلی۔ یہاں کی آبادی کی بہت بڑی تعداد اسماعیلی فرقہ سے تعلق رکھتی ہے۔

قاسم شاہی سلسلے کے چھیالسویں امام حسن علی شاہ (1804-1881)، جو کہ آغا خان اول کے لقب سے مشہور ہیں، نے 1842 میں ایران کے قاچار بادشاہ کے خلاف بغاوت کی جو ناکام رہی۔ انہوں نے بادشاہ کے عتاب سے بچنے کے لیے ہندوستان کا رخ کیا اور اپنا مرکز بمبئی کو بنایا۔ بعد میں انہوں نے اپنی دعوت کو یورپ میں پھیلایا۔ کچھ عرصہ انہوں نے رائل برٹش آرمی میں کام بھی کیا۔ ان کے پوتے، سلطان محمد شاہ (1877-1957) تھے، جو کہ آغا خان سوئم کہلاتے تھے۔ یہ 1906 میں آل انڈیا مسلم لیگ کے بانی ارکان میں سے تھے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں اسماعیلی کمیونٹی بہت منظم ہوئی اور اس کی مختلف شاخیں یورپ اور مشرقی افریقہ میں قائم ہوئیں اور انہیں منظم کیا گیا۔ ان کے دور میں اسماعیلیوں نے سلور، گولڈن، پلاٹینم اور ڈائمنڈ جوبلی کا انعقاد کیا جس میں آغا خان کو چاندی، سونے، ہیروں اور پلاٹینم میں تولا گیا۔ یہ اسماعیلی کمیونٹی کی جانب سے اپنے امام کے لیے عقیدت کا اظہار تھا۔ یہ رقم آغا خان فاؤنڈیشن کے تحت مختلف رفاہی اداروں کو دے دی گئی۔ [6]

موجودہ آغا خان چہارم (b. 1936) پیرس کے قریب اپنے عالیشان محل میں رہتے ہیں اور وہاں سے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اپنے پیروکاروں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ ان کے دنیا کی بڑی سیاسی طاقتوں سے اچھے تعلقات ہیں اور ان کے دور میں آغا خانی کمیونٹی نے دنیا کے مختلف خطوں میں زبردست ترقی کی ہے۔ ان کی امامت کی گولڈن جوبلی 2007 میں منائی گئی۔ [7]

مستعلوی اسماعیلیہ: بوہری

اسماعیلیوں کو نزاری اور مستعلوی گروہوں میں تقسیم سے پہلے ہی شمالی افریقہ میں اقتدار حاصل ہو چکا تھا۔ انہوں نے 296/909 میں تیونس میں اپنی حکومت قائم کی جو آہستہ آہستہ پھیل کر موجودہ لیبیا اور مصر تک محیط ہو گئی۔ یہ "فاطمی خلافت" (296-566/909-1171) کہلاتی تھی۔ یہ سلطنت طویل عرصہ تک ان علاقوں پر قائم رہی اور اپنی شان و شوکت میں بغداد کی عباسی اور اسپین کی اموی سلطنت کا مقابلہ کرتی رہی۔ چونکہ ان کی حکومت زیادہ تر سنی عوام پر قائم تھی، اس وجہ سے انہوں نے اہل سنت کے متعدد طور طریقوں کو اختیار کر لیا اور شریعت پر عمل کرتے رہے۔ ان کے امام مستنصر باللہ (419-486/1029-1094) کی جانشینی پر اختلاف ہوا۔ ایک گروہ کے نزدیک ان کے جانشین نزار (436-489/1045-1097) تھے۔ چنانچہ یہ گروہ نزاری فرقے کی شکل میں الگ ہو گیا اور

اس کی تفصیل کا مطالعہ آپ اوپر کر چکے ہیں۔ دوسرے گروہ نے مستعلی باللہ (d. 493/1101) کو اپنا امام مانا اور یہ "مستعلوی" کہلائے اور مصر پر حکومت کرتے رہے۔ مشہور "جامعۃ الازہر" بھی انہوں ہی نے قائم کی۔ ان کی عباسی سلطنت اور دیگر سلاطین سے جنگیں بھی ہوتی رہیں اور بالآخر سلطان صلاح الدین ایوبی (reign 569-589/1174-1193) کے ہاتھوں 566/1171 میں فاطمی خلافت کا خاتمہ ہوا۔[8]

خلافت کے خاتمے کے بعد مستعلوی اسماعیلی بکھر گئے۔ چونکہ ان کے ہاں دعوت کا سارا کام خفیہ ہوتا تھا، اس وجہ سے اکثر ایسا ہو جاتا تھا کہ ایک امام کی وفات کے بعد ان کی بیٹوں میں امامت کے بارے میں اختلاف ہو جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ان کے پیروکار گروہوں میں تقسیم ہو جاتے۔ تقسیم در تقسیم کا یہ سلسلہ جاری رہا اور اس وقت اسماعیلی حضرات کے بہت سے گروہ موجود ہیں۔ مستعلوی اسماعیلیوں کے ایک گروہ نے مصر نے نکل کر لبنان کو اپنی دعوت کا مرکز بنایا۔ یہ لوگ "دروز" کہلاتے ہیں اور اب بھی کافی بڑی تعداد میں لبنان اور شام میں موجود ہیں۔ ان کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

567/1172 میں ان کے دوسرے گروہ نے یمن کو اپنی دعوت کا مرکز بنایا اور یہیں سے بذریعہ سمندر برصغیر میں داخل ہوئے جہاں یہ "بوہرہ" کہلائے۔ بوہریوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان کے امام طیب 546/1151 میں غائب ہو گئے تھے جسے وہ دوسرا "ستر (Occultation)" کہتے ہیں۔ امام کے بعد "داعی" کا ادارہ قائم کیا گیا۔ چنانچہ اب ان کے ہاں امام کی بجائے داعی ہوتے ہیں جن کے بارے میں یہ تصور ہے کہ یہ داعی حضرات، غائب امام سے براہ راست ہدایت حاصل کر کے لوگوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ داعی ہونے پر اختلافات کے باعث ان کے متعدد گروہ ہو گئے جن میں داؤدی بوہرے سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے موجودہ داعی محمد برہان الدین (b. 1915) ہیں جو کہ داعیوں کی اس زنجیر میں 52ویں نمبر پر ہیں۔ 974/1567 میں ان کا مرکز یمن سے منتقل ہو کر برصغیر کا صوبہ گجرات بنا۔ اس وقت ان کی بڑی کمیونٹی بھارت میں گجرات و مہاراشٹر اور پاکستان میں کراچی میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی افریقہ اور یمن میں بھی بوہریوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔

بوہری حضرات کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اسلام کے سات ارکان ہیں: ولایت، طہارت، نماز، زکوۃ، روزہ، حج اور جہاد۔ دیگر اثنا عشری شیعہ حضرات کی طرح یہ کلمہ شہادت اور اذان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت، خلیفہ بلافصل اور وصی الرسول ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔[9]

بوہریوں کی ایک بڑی تعداد نے سلطان فیروز شاہ تغلق (751-790/1351-1388) کے دور میں اہل سنت میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ یہ لوگ سنی بوہرے کہلاتے ہیں اور اہل سنت کے حنفی مکتب فکر کی پیروی کرتے ہیں۔ دور جدید میں پروگریسو بوہری کے نام سے ان کے ہاں ایک تحریک پیدا ہوئی ہے جو کہ مذہبی جمود کے خاتمے کے لئے کوشاں ہیں۔ ہندوستان کے مشہور لبرل عالم اصغر علی انجینئر (b. 1939) بھی ان بوہری حضرات میں شامل ہیں جنہوں نے اپنے فرقے کی روایت سے بغاوت کی ہے۔

مستعلوی اسماعیلیہ: دروز

دروز اسماعیلیوں کا وہ فرقہ ہے جو مین اسٹریم مسلمانوں سے عقائد و اعمال میں شاید سب سے دور چلا گیا حالانکہ دیگر اسماعیلی فرقوں جیسے بوہریوں نے خود کو مین اسٹریم سنی اور شیعہ فرقوں کے قریب رکھا ہے۔ دروز زیادہ تر عیسائی فرقہ "غنوسطی ازم (Gnosticism)" سے متاثر ہوئے اور انہوں نے ان کے متعدد عقائد کو اپنے اندر شامل کر لیا۔ غنوسطی چونکہ یونانی فلسفہ سے متاثر تھے، اس لیے ان کے ذریعے دروزیوں کے اندر بھی یونانی فلسفہ اس درجے میں آ گیا کہ افلاطون کو پیغمبر مان لیا گیا۔ ان کے عقیدے کے مطابق اللہ تعالی فاطمی خلیفہ الحاکم کے اندر حلول کر گیا جس سے وہ 411/1021 میں غائب ہو گئے۔

دروز قرآن مجید کو مقدس کتاب سمجھتے ہیں مگر اس کے الفاظ کو محض "ظاہر" قرار دیتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ اس کے باطنی معنی بھی ہیں۔ ان کی اپنی ایک مقدس کتاب بھی ہے جو کہ "کتاب الحکمۃ" کہلاتی ہے۔ ہندوؤں کے طرز پر دروز بھی تناسخ یا آواگون کے عقیدے پر یقین رکھتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد روح ایک جسم چھوڑ کر دوسرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے زندگی کے متعدد ادوار پورے کرنے کے بعد ان کے خیال میں انسانی روح، اللہ تعالی سے جا ملتی ہے۔ اسی کو ان کے ہاں جنت کہا جاتا ہے۔ دروز فرقے کے ماننے والوں کے ہاں دو طبقات پائے جاتے ہیں: جہال اور عقال۔ جہال (جاہل کی جمع) عام لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں مذہبی کتابیں پڑھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ حق صرف عقال (عاقل کی جمع) کو ہوتا ہے جو کہ دروز کے مذہبی راہنما ہوتے ہیں۔ ان میں سے پچاس عقال کا انتخاب ہوتا ہے جو کہ "اجاود" کہلاتے ہیں۔ یہ ان کی کمیونٹی کے راہنما ہوتے ہیں۔ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ پر دروز عام طور پر عمل نہیں کرتے ہیں اور ان کی بجائے اپنے اجتماعات کو عبادت قرار دیتے ہیں۔ ان کے اجتماعات جمعرات کے دن ہوتے ہیں۔[10]

دروز کے ہاں معاملات کو خفیہ رکھا جاتا ہے۔ یہ اپنی کمیونٹی میں کسی اور کو کبھی شامل نہیں کرتے ہیں۔ ان کا مرکز شام میں "جبل الدروز" ہے۔ ان کی کمیونٹی شام اور لبنان میں بڑی تعداد میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہ اردن اور فلسطین میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کی کمیونیٹیز آسٹریلیا اور امریکہ میں بہت متحرک ہیں۔

علوی

علوی اہل تشیع ہی کا ایک فرقہ ہے جس کے بارے میں یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ یہ اسماعیلی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں یا اثنا عشری سے کیونکہ یہ اپنا عقیدہ چھپاتے ہیں اور اس کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ شام میں یہ سب سے بڑی اقلیت ہیں اور وہاں کی برسر اقتدار خاندان بھی علوی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لبنان اور ترکی میں بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ لبنان کے علوی حضرات کے

بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا نقطہ نظر وہی ہے جو اثنا عشری شیعوں کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل تشیع کے امام موسی الصدر (1928-1978) نے انہیں شیعہ قرار دیا ہے۔[11]

ترکی کے علوی حضرات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا عقیدہ اہل سنت اور اہل تشیع سے کافی مختلف ہے اور یہ صوفیوں کے بکتاشی فرقہ سے متاثر ہیں اور ان کے نظریات میں اہل سنت، عیسائیت، تشیع، باطنیت سبھی کی آمیزش ہے۔ تاہم ان کے اپنے ذرائع سے ان میں کسی بات کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

اسائن منٹس

1. اہل تشیع کے مختلف ذیلی فرقوں کے مابین اصل اور بنیادی اختلاف کس امر پر ہے؟
2. اہل تشیع کے فرقوں میں تقسیم ہونے کی وجوہات بیان کیجیے۔

تعمیر شخصیت

دوسروں کو دکھانے کے لئے نیک کام کرنا ریاکاری کہلاتا ہے۔ ایسے اعمال اللہ تعالی کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوا کرتے۔

---

[1] علی حسین رضوی، تاریخ شیعان علی۔ ص54

[2] عباد بن صاحب۔ الزیدیہ

[3] Wikipedia: "Zaidiyya"
[4] Khodr Hamawi, Introduction to Ismailism, www.ismailiya.net
[5] Wikipedia: Batiniyya
[6] Wikipedia: Aga Khan III
[7] Wikipedia: Aga Khan IV
[8] Wikipedia: Mustali
[9] Wikipedia: Dawoodi Bohra
[10] Druze (Muwahidoon). http://www.druze.org.au/religion/index.htm (accessed 3 Oct 2011)

[11] حسن مہدی الشیرازی (1972)۔ **المسلمون العلویون**۔ http://www.freemoslem.com/showthread.php?t=222 (accessed 3 Oct 2011)

سبق 10: اہل سنت اور اہل تشیع کی تاریخ کا سیاسی اور معاشرتی پہلو

اہل سنت اور اہل تشیع کی تاریخ ایک دوسرے سے تعلق کے معاملے میں ملی جلی ہے۔ کہیں ان کے مابین اتحاد بین المسلمین کی صدائیں بلند ہوتی رہی ہیں تو کہیں اختلافات علمی سطح سے اٹھ کر عوامی فساد کی صورت اختیار کرتے رہے ہیں۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ دونوں گروہ صدیوں تک ایک ہی علاقے میں اکٹھے رہتے چلے آئے ہیں اور کبھی سیاسی جنگوں کے لئے فرقہ وارانہ اختلافات کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس سب کے ساتھ ساتھ علم وعقائد اور رسوم و آداب کے میدان میں یہ دونوں گروہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔

تاریخ میں اہل تشیع نے بالعموم اپنے لیے حکمرانوں کی اپوزیشن کا کردار پسند کیا۔ بنو امیہ کے نوے سالہ دور میں بنو ہاشم کی جانب سے متعدد تحریکیں اٹھیں جن میں نہ صرف اہل تشیع بلکہ بہت سے اہل سنت نے ان کا ساتھ دیا۔ اس دور تک دونوں گروہوں کے عقائد میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ بنو امیہ کے کرپٹ حکمرانوں کے مقابلے میں بنو ہاشم کے بزرگوں کے کردار کو عام مسلمان پسند کرتے تھے اور ان کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ ان میں حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کے بیٹے زید رحمۃ اللہ علیہ (75-122/695-740) اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے نفس زکیہ (d. 144/762) کی بغاوتیں زیادہ مشہور ہیں۔

جب بنو امیہ کے اقتدار کے خاتمے کے لئے بنو عباس (132-918/750-1513) نے زبردست تحریک برپا کی تو اہل تشیع نے بالعموم ان کا ساتھ دیا۔ یہ تحریک کامیاب رہی اور بنو امیہ کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد بنو عباس نے جب حکومت سنبھال لی تو شیعہ جو ائمہ اہل بیت کی حکومت کی امید لگائے بیٹھے تھے، نے ان کی سخت مخالفت کی۔ بعد میں بعض شیعہ گروہ جیسے آل بویہ (322-447/934-1055) عباسیوں کے ساتھ اقتدار میں شریک ہو گئے اور عملاً حکومت کا نظام چلاتے رہے۔

اہل تشیع کو تاریخ میں دو مرتبہ مختلف علاقوں پر کامل اقتدار نصیب ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ انہیں شمالی افریقہ پر اقتدار فاطمی خلافت (296-566/909-1171) کی صورت میں ملا۔ یہ اہل تشیع کے اسماعیلی فرقے کے مستعلوی گروہ کی حکومت تھی۔ اسی حکومت کے عرصے میں قاہرہ آباد ہوا اور جامعۃ الازہر کی مشہور یونیورسٹی بنائی گئی۔ بعد میں سنی فاتح صلاح الدین ایوبی نے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ دوسری مرتبہ اثنا عشری شیعہ حضرات کو ایران میں صفوی بادشاہت (906-1148/1501-1736) کے دور میں اقتدار ملا۔ اس سے پہلے ایران ایک سنی اکثریتی ملک تھا جہاں سے اہل سنت کے بڑے بڑے عالم جیسے امام غزالی (450-505/1058-1111) اور فخر الدین رازی (543-606/1148-1209) وغیرہ پیدا ہوئے۔ صفوی دور حکومت میں ایران ایک شیعہ اکثریتی ملک میں تبدیل ہو گیا۔ اہل سنت کا کہنا

یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کو شیعہ مسلک اختیار کرنے پر زبردستی مجبور کیا گیا اور جن لوگوں نے اپنا مسلک تبدیل نہ کیا، انہیں ملک چھوڑ دینے پر مجبور کیا گیا۔ صفوی بادشاہت کے دونوں جانب اہل سنت کی دو عظیم بادشاہتیں موجود تھیں، اس کے مشرق میں ہندوستان کی مغل حکومت تھی اور مغرب میں ترکی کی سلطنت عثمانیہ۔ پہلی کے ساتھ صفوی سلطنت کے تعلقات اچھے رہے جبکہ دوسری کے ساتھ متعدد مرتبہ جنگ کی نوبت آئی۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے ایران میں قاچار خاندان (1732-1925) کے سنی حکمرانوں کی حکومت بھی رہی۔

برصغیر، خاص کر مغلوں کے دور میں اہل تشیع کا عمل دخل کافی رہا۔ جب ہمایوں (1508-1556) کو شیر شاہ سوری (1486-1545) نے ہندوستان کے اقتدار سے بے دخل کر دیا تو اس نے ایران کی صفوی حکومت سے امداد طلب کی۔ انہی کی مدد سے ہمایوں دوبارہ اقتدار میں آیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر میں اہل تشیع کا عمل دخل بڑھ گیا۔ جنوبی ہند یعنی دکن میں ان کی سلطنت قائم ہو گئی۔ ہمایوں کے پوتے جہانگیر کے دور میں شیعہ نقطہ نظر کو عروج حاصل ہوا کیونکہ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں شیعہ تھیں اور کاروبار سلطنت عملاً انہوں ہی نے سنبھالا ہوا تھا۔

تاریخ میں ایسے ادوار بھی آئے ہیں جس میں ایک گروہ نے دوسرے گروہ کو مذہبی جبر کا نشانہ بنایا ہے۔ ایک جانب شیعہ یہ شکایت کرتے ہیں کہ عہد بنو امیہ، بنو عباس، سلطنت عثمانیہ اور مغلوں میں خاص کر اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں انہیں جبر کا نشانہ بنایا گیا تو دوسری طرف سنی یہ دعوی کرتے ہیں کہ مصر کی فاطمی خلافت اور صفوی عہد کے ایران میں ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے اور انہیں زبردستی شیعہ ہو جانے پر مجبور کیا گیا۔ موجودہ دور میں بھی جہاں جہاں شیعہ اقلیت میں ہیں، وہ یہ دعوی کرتے ہیں کہ ان پر ظلم و ستم کیا جا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح ایران کے سنی بھی ایسے ہی دعوے کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ وہ نہایت کسمپرسی میں وہاں زندگی بسر کر رہے ہیں اور تہران میں دس لاکھ سنی آبادی کے باوجود ان کی ایک بھی مسجد نہیں ہے۔

اہل تشیع کے اہل سنت پر اثرات

اہل تشیع بالعموم فنون لطیفہ جیسے شاعری، موسیقی، ڈرامہ، فلم وغیرہ میں بہت متحرک رہے ہیں جس کے نتیجے میں اہل سنت پر ان کے اثرات بہت گہرے نظر آتے ہیں۔ اردو زبان کے بڑے شعراء جیسے غالب، میر انیس وغیرہ شیعہ ہیں۔ تاریخی تعامل کے نتیجے میں شیعہ نقطہ نظر کے اہل سنت پر جو اثرات مرتب ہوئے جن میں سے کچھ اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر عاشورہ محرم کو شیعہ حضرات کے ساتھ ساتھ بہت سے سنی حضرات بھی مناتے ہیں اور محرم کی مجالس میں شرکت کرتے ہیں۔ بعض سنی حضرات کی اپنی مجالس ہوتی ہیں جس میں ان کے اپنے خطیب رو رو کر واقعہ کربلا کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ رجب کے مہینے میں بہت سے سنی، کونڈوں کی نیاز دلواتے ہیں جو کہ ایک خالصتاً شیعہ تہوار سمجھا جاتا ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل سنت کے ہاں شہادت حسین کی تقریبات تشیع کا اثر نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اہل سنت کے نزدیک نہایت اعلی مقام کے حامل ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہل سنت خلفائے راشدین جیسے سیدنا عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کی شہادت کے معاملے میں ایسا کیوں نہیں کرتے۔

تشیع کا دوسرا اثر مزارات اور ان کی زیارت کے موقع پر نظر آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے زمانے میں ہمیں قبروں پر عالی شان تعمیرات تو کیا، پختہ قبور کا سراغ بھی نہیں ملتا ہے۔ ایک حالیہ تحقیق کے مطابق چوتھی صدی ہجری میں سب سے پہلے اہل تشیع نے ائمہ اہل بیت کے عالی شان مقابر تعمیر کیے اور انہیں اپنی زیارت اور عقیدت کا مرکز بنایا۔ اس کا اثر اہل سنت پر یہ ہوا کہ ان کے ہاں بھی بزرگان دین کے عالی شان مزارات تعمیر ہونا شروع ہو گئے اور ان کی زیارتوں کا سلسلہ جاری ہوا۔[1] اس کی مزید تفصیل کا مطالعہ ہم اگلے ماڈیول میں کریں گے۔

اہل تشیع کا سب سے زیادہ اثر سنی حضرات کی تاریخ کی کتابوں میں نظر آتا ہے۔ پہلی دو صدیوں تک شیعہ الگ فرقہ نہ بنے تھے بلکہ یہ ایک محض سیاسی جماعت تھی۔ سبھی مسلمان اکٹھے نماز پڑھتے اور مل جل کر رہا کرتے تھے۔ چونکہ اہل تشیع کے ہاں تاریخ کو ایک خاص زاویے سے دیکھا گیا ہے، اس وجہ سے اس میدان میں ان کے بہت سے لوگوں کو دلچسپی پیدا ہوئی اور تدوین کے دور سے پہلے ان میں تاریخ کے بڑے عالم گزرے۔ ان حضرات نے جو تاریخی روایات بیان کیں، انہیں سنی عالم ابن جریر طبری (224-310/838-922) نے اپنی تاریخ میں درج کر دیا۔ بعد کے سنی مورخین نے اسی کتاب کو اپنی تصانیف کا ماخذ بنایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیعہ حضرات کی روایات ان کی کتابوں میں داخل ہو گئیں۔ بہت سے سنی علماء جیسے ابن تیمیہ (661-728/1263-1327)، شیخ احمد سرہندی (971-1034/1564-1624)، شاہ ولی اللہ (1703-1762)، شاہ عبدالعزیز (1745-1823) وغیرہم نے ان روایات پر کڑی تنقید بھی کی ہے۔

اہل سنت کے اہل تشیع پر اثرات

اہل سنت اور اہل تشیع چونکہ صدیوں تک اکٹھے رہے ہیں، اس وجہ سے ان کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا ناگزیر تھا۔ جہاں اہل تشیع، اہل سنت پر اثر انداز ہوئے، وہاں اس کے برعکس معاملہ بھی جاری رہا۔

دور جدید میں اہل تشیع پر اہل سنت کا یہ واضح اثر نظر آتا ہے کہ ان کے ہاں حضرت ابو بکر، عمر، عثمان اور عائشہ رضی اللہ عنہم کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ قدیم شیعہ تصانیف میں ان حضرات کی شان میں گستاخیاں پائی جاتی ہیں مگر جدید تصانیف میں ان کا ادب ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ اگر ان حضرات پر کوئی تنقید بھی کی جائے تو اس میں احتیاط کی جاتی ہے اور گستاخانہ لب و لہجہ اختیار نہیں کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال جسٹس امیر علی (1849-1928) کی کتاب "روح اسلام (Spirit of Islam)" ہے۔ اسی طرح مکارم شیرازی صاحب کی تفسیر میں بھی مناسب لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اتحاد بین المسلمین کے لئے آیت اللہ خمینی صاحب نے صحابہ کرام

علیہم الرضوان کی شان میں گستاخی نہ کرنے کا فتویٰ جاری کیا تھا تاہم سنی علماء ان کی بعض ایسی تحریریں پیش کرتے ہیں جن میں صحابہ کرام کی شان میں گستاخی موجود ہے۔

بہت سے سنی اور شیعہ خاندانوں میں باہم شادیاں بھی ہوتی رہی ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے خیالات سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آنے والی نسلوں میں ایک دوسرے کے مسلکی نظریات مخلوط ہو جاتے ہیں۔

اسائن منٹس

1. اہل سنت اور اہل تشیع میں سے کون ایک دوسرے کی معاشرت پر زیادہ اثر انداز ہوا ہے؟ تفصیل سے وضاحت کیجیے۔
2. اہل تشیع کے اہل سنت پر اور اہل سنت کے اہل تشیع پر کیا اثرات نظر آتے ہیں؟

تعمیر شخصیت

اللہ کی مخلوق سے محبت کیجیے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ کسی انسان یا جاندار چیز کو تکلیف نہ دیجیے۔

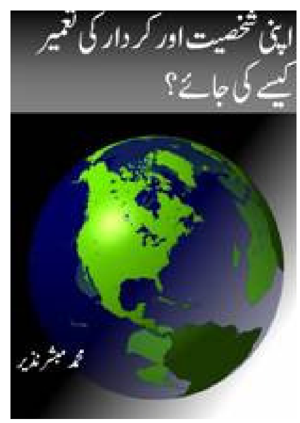

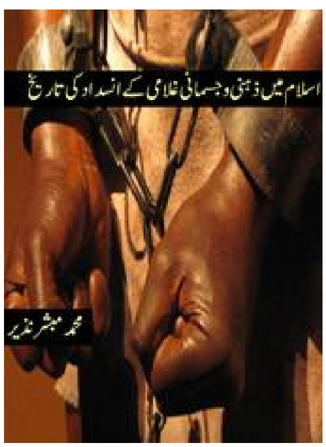

[1] محمد عزیر شمس۔ مقدمہ زیارت قبر نبوی۔ ص 15

سبق 11: خوارج، اباضی اور اہل سنت

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جو واقعات پیش آئے، ان کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاں تین بڑے سیاسی گروہ پیدا ہوئے: اہل تشیع، خوارج اور اہل سنت۔ وقت کے ساتھ ساتھ خوارج کا فرقہ معدوم ہو گیا اور اہل تشیع اور اہل سنت باقی رہے۔ مختلف مسائل میں اہل تشیع کے نقطہ نظر کا مطالعہ ہم پچھلے اسباق میں کر آئے ہیں۔ تاریخ کے بارے میں خوارج کے نقطہ نظر کا مطالعہ بھی آپ کر چکے ہیں۔ اس سبق میں ہم خوارج اور اباضی فرقوں کے نقطہ نظر کا تفصیلی مطالعہ کریں گے اور اس کا تقابل اہل تشیع اور اہل سنت کے نقطہ ہائے نظر سے کریں گے۔ اگرچہ خوارج اب معدوم ہو چکے ہیں، تاہم اس کے عقائد و نظریات کا مطالعہ تاریخ اسلام میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے اور وہ یہ کہ اس کی مدد سے پہلی صدیوں میں مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ خوارج کے مطالعے سے موجودہ دور کے تکفیری گروہوں کی نفسیات کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

عہد صحابہ و تابعین میں فرقوں کا ارتقاء

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت اسلام پورے جزیرہ نما عرب میں پھیل چکا تھا۔ بعض قبائل میں کچھ ایسے شر انگیز موجود تھے جنہوں نے دل سے اسلام قبول نہ کیا تھا، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد انہوں نے اسلام کو چھوڑ دینے کا اعلان کر دیا۔ ان میں سے بہت سے وہ تھے جنہوں نے مسیلمہ نامی ایک شخص کو نبی مان لیا۔ بعض لوگوں نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا اور حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دیگر صحابہ کے ساتھ مل کر ان لوگوں سے جہاد کیا اور بالآخر عرب میں ان تمام فتنوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد عربوں میں جو لوگ باقی بچے، انہوں نے پورے خلوص نیت کے ساتھ اسلام قبول کر لیا اور مسلمانوں کا حصہ بن گئے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں شام اور ایران کی سلطنتیں فتح ہوئیں اور یہ عمل سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور میں بھی جاری رہا۔ شام، فلسطین اور مصر پر پہلے رومی برسر اقتدار تھے جن کے مظالم سے یہاں کے باشندے تنگ تھے۔ جب مسلمانوں کا اقتدار یہاں پہنچا تو یہ لوگ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے رومیوں کے خلاف مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں نے بھی انہیں مکمل مذہبی آزادی دی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ ایران و عراق کا معاملہ البتہ مختلف تھا کیونکہ یہاں مجوس کی بہت بڑی سلطنت تھی جو مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں ختم ہو گئی تھی۔ مجوسیوں کے علاوہ یہاں مانی ازم (Manichaeism) کے پیروکار بھی آباد تھے۔ ان کا اپنا ایک فلسفہ اور تہذیب تھی جو مسلمانوں کے مقابلے میں شکست کھا گئی تھی لیکن انہوں نے بغاوتوں اور سازشوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے علاوہ ایک گروہ عرب کے ان لوگوں کا تھا جو اس پھیلتی ہوئی عظیم ایمپائر کی حکومت اور مالی وسائل پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور تک ان صحابہ کی بڑی تعداد، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست تربیت یافتہ تھے، وفات پا چکی تھی۔ دوسری جانب وہ لوگ جو مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیلانا چاہتے تھے، زیر زمین کام کر رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری سالوں تک یہ لوگ منظم ہو کر اس پوزیشن میں آ گئے کہ انہوں نے دار الحکومت مدینہ پر حملہ کر دیا۔ اس وقت مسلمانوں کی زیادہ تر افواج دور دراز سرحدی علاقوں میں موجود تھیں۔ مدینہ کے بہت سے لوگ بھی حج کے لیے مکہ گئے ہوئے تھے اور یہاں مردوں کی بہت کم تعداد باقی رہ گئی تھی۔ باغیوں کے اس منظم گروہ نے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ سیدنا علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم نے اپنے بیٹوں کی مدد سے خلیفہ مظلوم کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر باغیوں کی قوت ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ ان سب تفصیلات کا مطالعہ آپ پہلے کر چکے ہیں۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد باغیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ دیگر صحابہ نے بھی آپ کی بیعت کر لی مگر حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما مدینہ سے نکل کر مکہ آ گئے۔ یہ حضرات ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مل کر بصرہ آ گئے جو کہ ایک بڑی فوجی چھاؤنی تھی۔ باغیوں کی خواہش یہ تھی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو نمائشی خلیفہ بنا کر اصل اقتدار پر خود قبضہ کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک بڑے گروہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ قاتلین عثمان سے قصاص لیا جائے تاکہ ان لوگوں کی یہ سازش کامیاب نہ ہو سکے۔ دوسری جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کچھ عرصہ رک کر پہلے حکومت کو مضبوط ہو لینے دیا جائے، پھر قصاص لیا جائے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ ایک لشکر کے ساتھ بصرہ پہنچے اور سیدہ عائشہ اور حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم سے گفت و شنید کی۔ تمام معاملات طے ہو گئے مگر رات کو منافقین اور باغیوں کے اس گروہ نے دونوں کے لشکروں پر حملہ کر دیا۔ ہر لشکر نے یہ سمجھا کہ دوسرے فریق نے اس پر حملہ کر دیا ہے۔ اس طرح جنگ شروع ہو گئی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی دانشمندانہ حکمت عملی سے جنگ جلد ختم ہو گئی مگر اس وقت تک کافی نقصان ہو چکا تھا۔ یہ جنگ "جنگ جمل" کہلاتی ہے۔

باغیوں کے ساتھیوں کا ایک گروہ ففتھ کالمسٹ کی حیثیت سے شام میں بھی کام کر رہا تھا۔ انہوں نے شام میں کچھ ایسی افواہیں پھیلائیں جن سے یہ تاثر بنا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بس نمائشی خلیفہ ہیں اور اقتدار پر اصل قبضہ قاتلین عثمان کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شام کے گورنر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ جب تک وہ قاتلین عثمان سے قصاص نہ لیں گے، ان کی بیعت نہ کی جائے گی۔ اس مسئلے پر حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی افواج کے مابین جنگ ہوئی جو کہ "جنگ صفین" کہلاتی ہے۔ ایک موقع پر دونوں افواج کے درمیان سیز فائر ہو گیا اور یہ طے پایا کہ دونوں جانب سے ایک ایک شخص کو حکم (جج) بنایا جائے اور یہ دونوں حضرات مل کر اس اختلاف کا فیصلہ کریں۔ اس واقعے کو تاریخ میں "تحکیم" کہا جاتا ہے۔ سیدنا علی کی جانب سے حضرت ابو موسی اشعری اور سیدنا معاویہ کی جانب سے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم حکم مقرر ہوئے۔ یہ حضرات کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔

اس موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں سے ایک گروہ نے اعلان کیا کہ حکم بنانے کی وجہ سے حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما معاذ اللہ دونوں ہی کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو چکے ہیں، اس وجہ سے ان دونوں میں سے کسی کی بیعت جائز نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ گروہ ایک دم نہ بن گیا ہو گا بلکہ اس کے پیچھے ایک طویل منصوبہ بندی موجود رہی ہو گی۔ یہ گروہ "خارجی" یا "خوارج" کہلائے کیونکہ یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج سے نکل گئے تھے۔

خوارج کا یہ گروہ عراق میں حروراء کے مقام پر اکٹھا ہو گیا اور انہوں نے اپنے نقطہ نظر کی تبلیغ کرنا شروع کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ بہت عبادت گزار تھے اور نماز روزہ میں بہت شدت برتتے تھے۔ دینی معاملات میں بہت ہی کٹڑ اور مسلمانوں کو کافر قرار دینے کے معاملے میں بہت تیز تھے اور جا بجا کفر کا فتوی عائد کر دیا کرتے تھے۔ ان کی بنیادی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت تھی:

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنْ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ.

اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کروا دیا کرو۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے کے خلاف سرکشی کرے تو اس سرکشی کرنے والے سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے امر کی طرف لوٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کروا دو۔ اور انصاف کیا کرو، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (الحجرات 49:9)

خوارج اس آیت کا مطلب یہ اخذ کرتے تھے کہ جو گروہ بغاوت کرے، اس سے جنگ کرنا قرآن کی رو سے فرض ہے اور اس کے علاوہ کچھ اور کرنا جائز نہیں ہے بلکہ قرآن کی مخالفت کی وجہ سے کفر ہے۔ چونکہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بغاوت کی تھی، اس وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لازم تھا کہ وہ ان سے جنگ کرتے۔ اب چونکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ دو فیصلہ کرنے والے حکم مقرر کر دیے ہیں، اس وجہ سے انہوں نے حکم قرآنی کی خلاف ورزی کی ہے جس کے باعث وہ نعوذ باللہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے ہیں۔ اس کے برعکس سیدنا علی اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم کا موقف یہ تھا کہ حکم مقرر کرنا اس آیت کریمہ میں صلح کروانے کے حکم سے متعلق ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔

خوارج کا نقطہ نظر یہ تھا کہ قرآن کے ایک حکم کی خلاف ورزی بھی گناہ کبیرہ ہے اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اہل سنت کا نقطہ نظر یہ تھا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا گناہ گار ضرور ہوتا ہے مگر کافر نہیں ہوتا۔ خوارج اس نقطہ نظر کی بنیاد پر کثرت سے مسلمانوں پر کفر کا فتوی عائد کیا کرتے تھے۔ بہت مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ اپنے کسی لیڈر کو گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر کفر کا مرتکب قرار دے دیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ان کی اپنی جماعت فرقوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی۔[1]

چونکہ خوارج کی اپنی کوئی تصنیفات اس وقت موجود نہیں ہیں اور ان کے بارے میں جو معلومات دستیاب ہیں، وہ ان کے مخالفین کے

بیانات ہی سے ماخوذ ہیں، اس وجہ سے ان کے نقطہ نظر کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ بہر حال جو معلومات دستیاب ہیں، ان کے مطابق اس دور میں تین سیاسی گروہ پیدا ہو گئے تھے: شیعان علی، شیعان معاویہ اور خوارج۔ ان کے علاوہ چوتھا گروہ مین اسٹریم مسلمانوں کا تھا جو "اہل سنت" کہلائے۔ شیعان معاویہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور بنو امیہ کے دیگر حکمرانوں کا ساتھ دیا۔ جب 132/750 میں بنو امیہ کا اقتدار ختم ہوا تو یہ گروہ بھی ختم ہو گیا۔ اس کے باقی ماندہ افراد اسپین چلے گئے اور وہاں کی اموی حکومت کی حمایت کرتے رہے۔ بعد میں جب یہ حکومت بھی ختم ہو گئی تو بنو امیہ کے حامیوں کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ دوسری جانب خوارج بھی وقت کے ساتھ ختم ہو گئے جبکہ شیعان علی اہل تشیع کی شکل میں اب بھی باقی ہیں۔

خوارج کا عام مسلمانوں سے بنیادی اختلاف "تحکیم" کے مسئلہ پر تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ حکم بنانے کا فیصلہ کر کے سیدنا علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کافر ہو گئے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی اور جلیل القدر عالم سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو ان سے مباحثہ کے لیے بھیجا۔ خوارج اس کے باوجود قائل نہ ہوئے تو آپ نے ان سے تعرض نہیں کیا۔ خوارج کا تکیہ کلام "لا حکم الا اللہ" تھا یعنی اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں فرمایا: "یہ کلمہ حق ہے جسے باطل مقاصد کے لیے بولا جا رہا ہے۔"

کچھ عرصہ بعد خارجیوں نے تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر ان کی جان لینے اور ان کا مال لوٹنے کو مباح قرار دے دیا۔ اس موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ان کے خلاف فوجی کاروائی کرنا پڑی۔ نہروان کے مقام پر شدید جنگ ہوئی جس میں خوارج کی بڑی تعداد ختم ہو گئی۔ بعد میں یہ لوگ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی بار بار بغاوت کرتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے بنو امیہ اور بنو عباس کے مختلف ادوار میں بغاوتیں جاری رکھیں اور چند صدیوں کے بعد ان کا خاتمہ ہو گیا۔

پہلی دو تین صدیوں میں صورتحال کچھ اس طرح ہوئی کہ اہل تشیع بالعموم حضرت ابو بکر، عمر، عثمان اور معاویہ رضی اللہ عنہم پر تنقید کرتے تھے۔ بعض شیعہ حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا احترام کرتے مگر حضرات عثمان اور معاویہ رضی اللہ عنہما پر تنقید کرتے۔ انتہا پسندانہ نظریات رکھنے والے ان کی شان میں گستاخیاں بھی کرتے۔ اس کے بالکل برعکس خوارج سیدنا علی، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کی شان میں گستاخی کرتے۔ اہل سنت نے ان تمام حضرات کے ساتھ عقیدت مندی کا راستہ اختیار کیا اور ان کے باہمی اختلافات کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا۔

کچھ عرصے بعد خوارج مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئے جن میں ازارقہ، صفریہ اور محکمہ (Muhakkamah) شامل تھے۔ محکمہ میں سے ایک گروہ الگ ہوا جو کہ اباضیہ کہلایا۔ خوارج سے وابستہ فرقوں میں سے یہی وہ گروہ جو اب تک باقی ہے۔

اباضیہ

اس وقت دنیا میں خارجی فرقہ معدوم ہو چکا ہے البتہ ایک گروہ ایسا موجود ہے جس کے کچھ نظریات خوارج سے متشابہ ہیں۔ یہ "اباضی فرقہ" ہے جو عمان، لیبیا، الجیریا، تیونس اور مشرقی افریقہ کے بعض علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ عمان میں یہ اکثریت میں ہیں اور انہی کی حکومت قائم ہے۔ بقیہ ممالک میں یہ اقلیت میں ہیں۔ عام طور پر لوگ انہیں خارجیوں کا باقی رہ جانے والا ایک گروہ قرار دیتے ہیں مگر اباضی خود اس کی شدت سے نفی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ ایک الگ گروہ ہیں اور ان کا خوارج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے ناقدین ان کا شمار خوارج میں کرتے ہیں کیونکہ یہ بھی حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں ہی پر تنقید کرتے ہیں۔

اباضی حضرات بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ دین کا بنیادی ماخذ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے۔ بعض عقائد اور اعمال میں البتہ وہ مین اسٹریم مسلمانوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ اختلافی مسائل یہ ہیں:

اباضی علم الکلام

عقائد سے متعلق بعض مسائل میں اباضیوں نے کم و بیش وہی نقطہ نظر اختیار کیا جو کہ قرون وسطی کے ایک فرقے معتزلہ کا تھا تاہم ان کا دعوی یہ ہے کہ چونکہ اباضی، معتزلہ کی نسبت بہت قدیم فرقہ ہے، اس وجہ سے معتزلہ نے ان کا نقطہ نظر اختیار کیا تھا۔ یہاں ہم اباضی عالم علی یحیی معمر کی کتاب "الاباضیہ: مذہب اسلامی معتدل" میں سے ان اختلافی عقائد کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔ [2]

- قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ تعالی سے متعلق کچھ امور جیسے استواء علی العرش، اللہ تعالی کا ہاتھ وغیرہ کا ذکر ہوا ہے، اباضی حضرات ان تمام آیات کی تاویل کرتے ہیں اور انہیں لفظی مفہوم میں لینے کو درست نہیں سمجھتے۔ مثلاً اللہ تعالی کے ہاتھ سے مراد اس کی قوت ہے۔ اس کے برعکس اہل سنت عام طور پر ان آیات کو لفظی معنی ہی میں لیتے ہیں مگر یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ان امور کا صحیح مفہوم معلوم نہیں ہے کیونکہ ہم نے ان امور کو دیکھا نہیں ہے۔ یہ ویسے ہی ہیں جیسا کہ اللہ تعالی کی شان کے لائق ہے اور ان امور کو ہم انسانی امور پر قیاس نہیں کر سکتے۔
- اباضی حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ آخرت میں بھی کوئی شخص اللہ تعالی کا دیدار نہ کر سکے گا۔ اس کے برعکس اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ آخرت میں اللہ تعالی کا دیدار ممکن ہے۔
- اباضی عقیدہ کے مطابق جو شخص ایک مرتبہ جہنم میں داخل ہو گیا، وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ جن گناہ گار مگر صاحب ایمان لوگوں کو جہنم میں ڈالا جائے گا، ان کی سزا پوری کرنے کے بعد انہیں یہاں سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اسی وجہ سے اباضی حضرات ان لوگوں کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت پر یقین نہیں

رکھتے جو توبہ کیے بغیر دنیا سے چلے گئے۔

- خوارج کے برعکس اباضی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے کو کافر و مشرک قرار نہیں دیتے ہیں البتہ انہیں کفران نعمت کا مرتکب ضرور قرار دیتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ عام مسلمانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کو جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عام مسلمانوں کا ذبیحہ بھی حلال ہے۔
- اباضی حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالی کی مخلوق ہے۔ اس کے برعکس اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالی کا کلام ہے، مخلوق نہیں ہے۔
- میزان اور پل صراط کے متعلق اباضی حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ یہ حسی (Physical) اشیاء نہیں ہیں۔ میزان سے مراد نیک و بد اعمال میں فرق ہے۔ اس کے برعکس اہل سنت کا کہنا یہ ہے کہ یہ حسی اشیاء ہیں تاہم ان کی نوعیت کا ہمیں علم نہیں ہے کیونکہ ان کا تعلق آخرت سے ہے اور ہم ان کی حقیقت کو نہیں جان سکتے۔

خوارج اور اباضیوں میں فرق

خوارج کا گناہ کبیرہ سے متعلق نقطہ نظر یہ تھا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اس کی بنیاد پر وہ تقریباً تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے، ان کو قتل کرنا اور ان کے مال کو لوٹنے کو جائز سمجھتے تھے، اور ان کے ساتھ رشتہ داری اور شادی بیاہ کو حرام سمجھتے تھے۔

اباضیوں نے اس معاملے میں ان سے اختلاف کیا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا "کفر النعمہ" یا کفران نعمت کا ارتکاب کرتا ہے یعنی وہ اللہ تعالی کی ناشکری کا مجرم ہے مگر اس سے وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اباضیوں کے نزدیک بقیہ تمام مسلمان کافر نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک غیر اباضی مسلمانوں کے ساتھ شادی جائز ہے، ان کے ذبیحہ کو وہ حلال سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ وراثت کو بھی وہ درست تصور کرتے ہیں۔ اس کے برعکس خوارج کے نزدیک چونکہ تمام مسلمان کافر ہیں، اس وجہ سے وہ ان کے ساتھ نکاح، ذبیحہ اور وراثت کے تعلق کو درست نہیں سمجھتے۔

خوارج کا یہ نقطہ نظر تھا کہ اگر حکمران ظالم ہو تو اس کے خلاف بغاوت فرض ہے، خواہ انسان اس کی طاقت رکھتا ہو یا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری تاریخ بغاوتوں ہی پر مشتمل ہے۔ اس کے برعکس اباضیوں نے یہ نقطہ نظر اختیار کیا کہ ظالم حکمران کے خلاف بغاوت کرنا "جائز" ہے، "فرض" نہیں ہے۔ ان دونوں کے برعکس قدیم اہل سنت کی اکثریت کا نقطہ نظر یہ تھا کہ حکمران ظالم بھی ہو تو اس کے خلاف اس وقت تک بغاوت جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ کھلم کھلا کفر کا ارتکاب نہ کرے۔ اگر وہ ایسا کرے تو اس کے خلاف بغاوت جائز ہے بشرطیکہ مسلمان اسے ہٹانے کی طاقت رکھتے ہوں۔ اگر اتنی طاقت نہ ہو تو بغاوت جائز نہیں ہے۔

بہت سے لوگ اباضیوں کو خوارج ہی کا ایک فرقہ قرار دیتے ہیں مگر اباضی اس بات کی شدت سے نفی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ان پر جھوٹا الزام ہے۔ ان کا نقطہ نظر خوارج سے بہت زیادہ فاصلے پر ہے۔

تاریخ سے متعلق اباضیوں کا نقطہ نظر

اباضی حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو خلیفہ راشد سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے پہلے چھ سال بھی خلافت راشدہ ہیں۔ ان کے بعد کے دور پر اباضی تنقید کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض خود کو اسی گروہ سے متعلق سمجھتے ہیں جس نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ابتدائی ایام کو بھی وہ خلافت راشدہ پر مشتمل مانتے ہیں اور جنگ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حق پر مانتے ہیں لیکن اس کے بعد وہ مسئلہ تحکیم پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرتے ہیں اور جنگ نہروان میں خوارج کے قتل کی وجہ سے آپ پر تنقید کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اباضیوں کو خوارج کا ایک ذیلی فرقہ مانا جاتا ہے تاہم اباضی خود اس سے انکار کرتے ہیں۔ موجودہ دور کے اباضی علماء جیسے لیبیا کے شیخ ابو الربیع سلیمان البارونی، خمیس بن راشد العدوی، شیخ علی یحیی المعمر وغیرہ نے سیدنا عثمان و علی رضی اللہ عنہما پر تنقید سے اجتناب کیا ہے۔[3]

اباضی عبداللہ بن وہب الراسبی (d. 38/658) کو پانچواں خلیفہ راشد مانتے ہیں جنہیں خوارج نے اپنا امام مان لیا تھا اور یہ جنگ نہروان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقابلہ کرتے ہوئے قتل ہوئے تھے۔ یہ لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد کے حکمرانوں کو جائز خلیفہ تسلیم نہیں کرتے البتہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کو عادل حکمران مانتے ہیں۔ اس کے بعد اباضی حضرات اپنے ائمہ کو جائز حکمران تسلیم کرتے ہیں جن میں شمالی افریقہ کی رستمی سلطنت (160-296/776-909) شامل ہے۔

اباضیوں کا حدیث سے متعلق نقطہ نظر

اصولی طور پر اباضی احادیث کو مانتے ہیں تاہم وہ اہل سنت کی کتابوں میں روایت کردہ بعض احادیث کا انکار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایسی متعدد احادیث کو مانتے ہیں جو اباضی اور خارجی راویوں کے توسط سے روایت ہوئی ہیں۔ اباضی عالم جابر بن زید (d. 93/711) کا شمار بڑے ماہرین حدیث میں ہوتا ہے۔ اباضیوں کے نزدیک حدیث کا سب سے مستند ترین مجموعہ "مسند ربیع بن حبیب" ہے جو کہ "الجامع الصحیح" کے نام سے مشہور ہے اور جابر کے ایک شاگرد ربیع بن حبیب (d. 180/796) نے تصنیف کیا ہے۔ یہ مجموعہ اباضیوں کے نزدیک بخاری اور مسلم سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس مجموعے کو بہتر ترتیب اور اضافوں کے ساتھ ابو یعقوب الوارجلانی (d. 561/1165) نے مرتب کیا۔ اس مجموعے کی اکثر احادیث اہل سنت کے مجموعہ ہائے حدیث کے ساتھ مشترک ہیں، تاہم بعض احادیث کے معاملے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہل سنت کی قبول کردہ بعض احادیث کو اباضی موضوع (جعلی) قرار دیتے ہیں اور اہل سنت ان کی بعض احادیث کو موضوع سمجھتے ہیں۔

اباضیوں کے اصول حدیث ابو یعقوب الوارجلانی کے مرتب کردہ ہیں جو کم و بیش اہل سنت کے اصول حدیث سے ملتے جلتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک تمام صحابہ عادل ہیں اور ان پر تنقید نہیں ہو سکتی جبکہ اباضیوں کے نزدیک بعض صحابہ جیسے سیدنا عثمان و علی رضی اللہ عنہما پر تنقید ہو سکتی ہے۔ اباضی حضرات ان صحابہ پر بھی تنقید کرتے ہیں جنہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر خوارج سے جنگ کی۔ صحابہ پر تنقید کی وجہ سے اہل سنت انہیں اہل تشیع کے ساتھ بریکٹ کرتے ہیں۔[4]

اہل سنت کے علماء نے مسند ربیع بن حبیب پر شدید تنقید کی ہے اور اسے غیر مستند قرار دیا ہے۔ سعودی عالم ڈاکٹر سعد بن عبد اللہ آل حمید لکھتے ہیں:

یہ کتاب (مسند ربیع بن حمید) مستند نہیں ہو سکتی کیونکہ:

- اس کا اصل مخطوطہ (ہاتھ سے لکھی کتاب) ہی دستیاب نہیں ہے (جس سے موجودہ کتاب کا موازنہ کیا جا سکے۔)
- وارجلانی کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ موجودہ کتاب کی سند بھی موجود نہیں ہے جو وارجلانی تک جاتی ہو اور پھر وارجلانی سے لے کر ربیع بن حبیب تک کی سند بھی دستیاب نہیں ہے۔
- ربیع بن حبیب اور ان کے استاد ابو عبیدہ کے بارے میں تفصیلی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔۔۔۔
- جس دور میں محدثین نے حدیث کی کتابیں مرتب کیں اور ان پر تنقید کے اصول وضع کیے، اس دور میں یہ کتاب منظر عام پر نہیں تھی۔ اباضیوں کے قدیم علماء نے بھی اس کتاب میں موجود احادیث کی بنیاد پر اپنے دلائل پیش نہیں کیے۔ بعد کے دور کے اباضی یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کو ظالم حکومتوں کے خوف سے ظاہر نہیں کیا۔ یہ بات بھی درست نہیں ہے کیونکہ وہ اسے رستمی سلطنت کے دور میں تو ظاہر کر سکتے تھے جو کہ 130 سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی۔
- اس کتاب میں ایسے مسائل پر احادیث ہیں جن مسائل پر محدثین احادیث کو تلاش کرتے رہے۔ اگر وہ احادیث اس زمانے میں روایت ہو رہی ہوتیں تو محدثین انہیں ضرور اپنی کتب میں درج کرتے۔[5]

فقہ اباضی

اباضی حضرات کا اپنا ایک فقہ ہے جس کی بنیاد ان کی اپنی قبول کردہ احادیث پر ہے۔ اس فقہ کے اکثر مسائل میں وہ اہل سنت کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں اور بعض مسائل میں ان کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے ہاں نماز کا طریقہ کم و بیش وہی ہے جو عام مسلمانوں کا ہے۔ اس میں چند معمولی سے فرق ہیں جیسے اباضی، شیعہ اور مالکی مسلک کے لوگوں کی طرح ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں اور سورۃ فاتحہ کے بعد آمین نہیں کہتے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ جمعہ کی نماز صرف اسی بڑے شہر میں ہو سکتی ہے جہاں عادل حکومت قائم ہو۔ اب چونکہ عادل حکومت قائم نہیں ہے، اس وجہ سے یہ حضرات بالعموم جمعہ کی نماز نہیں پڑھتے۔ روزے کے معاملے میں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حالت جنابت میں ہو اور روزہ شروع ہو جائے تو اس کا روزہ نہیں ہو گا۔

اباضی حضرات کے اصول فقہ بنیادی طور پر وہی ہیں جو کہ اہل سنت کے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی دین کا بنیادی ماخذ قرآن ہے اور اس کے بعد سنت کا درجہ ہے۔ اگر قرآن و سنت میں کسی مسئلے سے متعلق حکم نہ ملے تو پھر اجماع صحابہ کا درجہ ہے۔ اگر اس مسئلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں اختلاف رائے پایا جاتا ہو تو ان میں سے سب سے بہتر رائے کا انتخاب کرنے کی سر توڑ کوشش کی جائے گی۔ اگر صحابہ کرام سے کسی مسئلے میں کچھ بھی منقول نہ ہو تو پھر قدیم اباضی علماء کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اگر ان کی جانب سے بھی کچھ منقول نہ ہو تو مجتہد عالم اپنی رائے سے اجتہاد کر سکتا ہے۔ اسے یہ حضرات "استدلال" کہتے ہیں۔ اباضی حضرات شخصیت پرستی اور تقلید کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے اصول فقہ کا تفصیلی جائزہ ہم فقہی مسالک سے متعلق ماڈیول میں لیں گے۔

سیاسی مسائل میں اباضیوں کا نقطہ نظر

اباضی عالم محمد یحیی المعمر سیاسی مسائل میں اپنے گروہ کا نقطہ نظر اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہم ان (اباضیوں کے) کے سیاست سے متعلق اصول کو درج ذیل نکات کی صورت میں بیان کر سکتے ہیں:

- امامت کا معاہدہ اللہ تعالی کی جانب سے فرض ہے۔ عدل کو قائم کرنا، حقوق کو ان کے جائز مقامات سے لینا اور جائز مقامات پر رکھنا، دشمن سے جہاد کرنا وغیرہ۔ اس کی دلیل کتاب، سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔
- اسلامی حکومت (خلافت) قریش یا عرب تک محدود نہیں ہے (بلکہ کوئی بھی مسلمان خلیفہ بن سکتا ہے۔)
- عادل حکمران کے خلاف بغاوت جائز نہیں ہے۔
- ظالم حکمران کے خلاف بغاوت جائز ہے مگر خوارج کے نقطہ نظر کے برعکس واجب نہیں ہے۔ اسی طرح اشاعرہ کے نقطہ نظر کے برعکس یہ ممنوع بھی نہیں ہے۔ یہ صرف اس وقت جائز ہے جب غالب گمان اس کی کامیابی کا ہو۔۔۔۔
- حکمران کا انتخاب مشورے سے ہو گا اور ارباب حل و عقد (جو لوگ فیصلہ کرنے کی اتھارٹی رکھتے ہوں) کی اکثریت کے اتفاق سے ہو گا۔
- گورنروں کا تعین حکمران کی ذمہ داری ہو گی۔ اس کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ ہر علاقے کے گورنر کے تعین یا سبکدوشی کے وقت اس کے علاقے کے اہل حل و عقد سے مشورہ کرے۔
- امت مسلمہ کے لیے بغیر امام یا سلطان کے رہنا جائز نہیں ہے۔
- ظالم حکمران سے عدل کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اگر وہ عدل قائم نہ کرے تو اس سے مسلمانوں کے امور سے الگ ہونے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اگر وہ یہ بات بھی نہ مانے تو قوت کے ذریعے اس کے خلاف بغاوت کرنا جائز ہے اگرچہ اس دوران اسے قتل بھی کر دیا جائے۔ یہ اس وقت ہے جب بغاوت اس سے بڑے فتنہ میں مبتلا نہ کر دے۔
- ظالم حکمران خواہ اباضی ہو یا غیر اباضی، مسلمانوں کی امان سے بری ہے اور اس کی فوجی چھاؤنی، سرکشوں کی چھاؤنی تصور ہو گی۔

- مسلمانوں کی حکومت کے خلاف بغاوت جائز نہیں ہے سوائے اس کے کہ ظلم و ستم کا خاتمہ مقصود ہو۔
- امت مسلمہ کے حکمران ایک سے زائد ہو سکتے ہیں اگر اس کا علاقہ وسیع ہو۔[6]

اباضی مسلک کی تاریخ

اباضی خود کو عبد اللہ بن اباض المری التمیمی سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ صاحب تابعی تھے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ (reign 40-60/660-680) کے دور سے لے کر عبد الملک بن مروان (reign 65-86/685-705) کے دور تک زندہ تھے۔ ان کے بارے میں زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق خارجیوں کے گروہ سے تھا۔ جب خوارج نے تمام مسلمانوں کو کافر و مشرک قرار دے کر ان سے ہر قسم کا ناتا توڑ لیا اور ان کے جان و مال کو مباح ٹھہرا لیا تو عبد اللہ بن اباض نے اس مسئلے میں خوارج سے شدید اختلاف کیا اور معتدل نقطہ نظر اختیار کیا۔ انہوں نے بادشاہ وقت عبد الملک بن مروان کو خط بھی لکھا جس میں انہوں نے خوارج کے مقابلے میں اپنا نقطہ نظر واضح کیا کہ وہ بغاوت کو درست نہیں سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان کے خلاف کسی بغاوت میں شریک ہیں۔ لیبیا کے اباضی عالم سلیمان البیرونی نے اس خط کا متن اپنی کتاب "مختصر تاریخ الاباضیہ" میں نقل کیا ہے۔ اس خط میں انہوں نے بادشاہ کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار کیا۔ اس کے بعض مشمولات یہ ہیں:

> اے عبد الملک! آپ نے مجھے خط لکھ کر یہ مطالبہ کیا ہے کہ میں آپ کو جواب لکھوں اور خیر خواہی کی کوشش کروں۔۔۔ میں آپ کو اللہ کی کتاب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف بلاتا ہوں اور یہ کہ آپ ان کی حلال کردہ چیزوں کو حلال اور ان کی حرام کردہ چیزوں کو حرام رکھیں۔ ان کے فیصلوں سے راضی رہیں، اپنے رب کی طرف توبہ کریں اور اللہ کی کتاب کی طرف رجوع کرتے رہیں۔ میں آپ کو اللہ کی کتاب کی طرف بلاتا ہوں جو کہ میرے اور آپ کے درمیان ان امور کا فیصلہ کرے جس میں ہم اختلاف کر رہے ہیں۔۔۔ یہی وہ واضح راستہ ہے جس پر اللہ نے ہم سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دو صالح خلفاء (ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) کو ہدایت دی۔۔۔ محتاط رہیے کہ کہیں آپ اس راستے سے بھٹک نہ جائیں اور اپنی خواہشات کی پیروی، جس کے لیے لوگ آپ کے گرد جمع ہیں، کے سبب گمراہی آپ کا مسلط نہ جائے۔[7]

بنو امیہ کے دور (40-133/660-750) میں خوارج نے بار بار بغاوتیں کیں جن میں سرکاری فوج ان کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ ان میں سے جو باقی بچے، وہ بنو عباس کے دور میں ختم ہو گئے۔ اس کے برعکس اباضیوں نے اپنا کام خاموشی سے جاری رکھا اور بغاوتوں میں عام طور پر حصہ نہیں لیا۔

ابن اباض کے ہم عصر اور ہم خیال جابر بن زید الازدی (d. 93/711) تھے جو کہ بہت بڑے عالم اور بصرہ کے مفتی تھے۔ ویسے ان کا تعلق موجودہ عمان سے تھا۔ انہوں نے متعدد جلیل القدر صحابہ اور تابعی علماء سے تعلیم حاصل کی۔ عبد اللہ بن اباض اور جابر بن زید کے بعد اباضیوں کی قیادت ابو عبیدہ مسلم بن ابی کریمہ (d. 150/766) کے ہاتھ میں آئی جنہوں نے اباضی دعوت و تبلیغ کا کام بڑے پیمانے پر منظم کیا۔ ابو عبیدہ کے ایک شاگرد ربیع بن حبیب (d. 180/796) تھے جنہوں نے محدثین کے طریقے پر احادیث اکٹھی کیں اور

"الجامع الصحیح" کے نام سے اپنا مجموعہ ترتیب دیا، جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اباضیوں کی دعوت بڑی تیزی سے یمن، عمان، خراسان اور شمالی افریقہ میں پھیلی۔ یہ وہی دور تھا جب اہل تشیع کے مختلف فرقے بھی اپنی دعوت کو پھیلانے کا کام بڑے پیمانے پر کر رہے تھے۔ بعد میں یمن میں اہل تشیع کا زیدی مسلک غالب آ گیا، اور خراسان میں اہل سنت اور اثنا عشری شیعہ مسلک کا غلبہ ہو گیا۔ عمان میں اب تک اباضی فرقہ ہی کا غلبہ ہے۔

اباضیوں کی دعوت کو سب سے زیادہ فروغ شمالی افریقہ میں ہوا جب 160/776 میں موجودہ تیونس، لیبیا اور الجیریا کے متعدد علاقوں پر ان کی حکومت قائم ہوئی جو کہ ڈیڑھ سو برس تک قائم رہی اور 296/909 میں اسماعیلی شیعوں کی فاطمی حکومت کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ یہ رستمی خاندان کہلاتا تھا۔ اپنے دور حکومت میں ان حضرات غیر اباضی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا۔ اس حکومت کے خاتمے کے بعد شمالی افریقہ میں اباضیوں کی تعداد کم ہونا شروع ہوئی اور اس وقت بہت ہی کم علاقوں میں ان کی آبادی اکثریت میں ہے۔

دوسری جانب مشرق میں اباضی دعوت زیادہ تر عمان میں پھیلی۔ خلافت راشدہ کے دور میں عمان کی حیثیت ایک نیم خود مختار صوبے کی تھی۔ بنو امیہ کے دور میں حجاج بن یوسف نے اس کی جانب کئی فوجی مہمات بھیجیں۔ اس دوران اباضی اپنی دعوت پھیلاتے رہے اور 143/760 میں اباضی امام جلندا ابن مسعود نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ عباسی بادشاہوں نے عمان کی طرف کئی لشکر روانہ کیے اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ درمیان میں کبھی اباضی حکومت قائم ہو جاتی اور کبھی عباسی، آل بویہ، سلجوق اور دیگر حکمرانوں کا اقتدار قائم ہو جاتا۔ 920/1515 میں یہاں پرتگالیوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ وہ دور تھا جب بحر ہند پر پرتگالی، اسپینی، فرانسیسی اور انگریزوں کا اقتدار شروع ہو چکا تھا۔ یہ سلسلہ 1060/1650 تک چلا اور اس کے کچھ عرصے بعد عمان پر ایرانیوں نے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اباضی حکمرانوں کے مختلف ادوار اب تک یہاں قائم ہیں اور موجودہ سلطان قابوس کا تعلق بھی اباضی فرقہ ہی سے ہے۔ [8]

اسائن منٹس

1. اباضی اور خوارج کے مابین بنیادی نکتہ اختلاف کیا تھا؟ تفصیل سے وضاحت کیجیے۔
2. اس سبق میں آپ نے جو تفصیلات پڑھی ہیں، ان کی روشنی میں بیان کیجیے کہ اباضیوں اور اہل سنت کے مابین بنیادی فرق کیا ہے؟
3. اباضی اور اہل تشیع کے اختلافات سے متعلق اس سبق میں بحث نہیں کی گئی لیکن ان سے متعلق جو تفصیلات یہاں دی گئی ہیں، ان کی روشنی میں اس بات کا تعین کیجیے کہ اباضی اور اہل تشیع کے مابین کس بات پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے؟

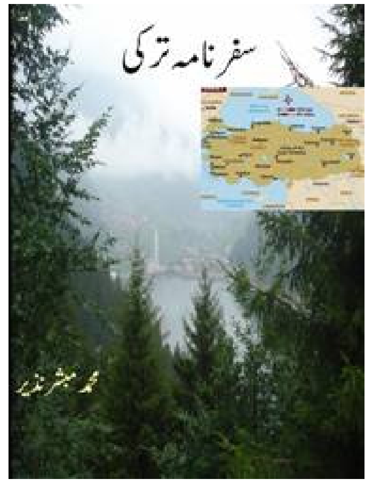

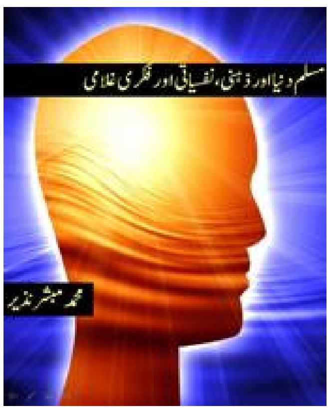

[1] Fazal ur Rahman. Revival and Reform in Islam. P 36. London: One World Publications (2006)

[2] علی یحیی معمر۔ الاباضیہ: مذہب اسلامی معتدل۔ ص 8-9

[3] Hoffman, Valerie J. *Ibadi Islam: An Introduction*. http://www.uga.edu/islam/ibadis.html (accessed 3 Oct 2011)

[4] Ibid

[5] سعد بن عبداللہ بن عبدالعزیز آل حمید۔ مسند الربیع بن حبیب الاباضی: دراسۃ نقدیہ (عربی) فی "مجلہ جامعۃ ام القری لعلوم الشریعۃ والدراسات الاسلامیہ، مکہ المکرمہ، رجب 1430/2009۔ ص2

[6] علی یحیی معمر۔ الاباضیہ: مذہب اسلامی معتدل۔ ص 8-9

[7] سلیمان البارونی۔ مختصر تاریخ الاباضیہ۔ ص 22-23

[8] Ennami, Dr. Amr Khalifa. A Concise History of Al-Ibadhiyah. http://www.angelfire.com/ok5/ibadhiyah/history.html (accessed 3 Oct 2011)

سبق12: ماڈیول CS01 کا خلاصہ

ذیل میں ہم ایک چارٹ پیش کر رہے ہیں جس میں اب تک ہم نے شیعہ سنی اختلاف کا جو مطالعہ کیا ہے، اس کا ایک خلاصہ آ جائے گا۔

	اہل سنت	اہل تشیع	اباضی
آبادی کا اندازہ	ایک ارب دس کروڑ	بیس کروڑ	ایک کروڑ
اکثریتی آبادی کے علاقے	تقریباً سبھی مسلم ممالک (سوائے ایران، عراق، یمن اور عمان کے)	ایران، عراق، یمن (بڑی اقلیت پاکستان، افغانستان، لبنان)	عمان۔ (بڑی اقلیت الجیریا، لیبیا، زنجبار)
عقیدہ امامت	امامت دین کا بنیادی عقیدہ نہیں ہے	امامت بنیادی عقیدہ ہے جس کا انکار کفر ہے	امامت دین کا بنیادی عقیدہ نہیں ہے تاہم مرکزیت کا رجحان ہے
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسے جانشین مقرر فرمایا؟	کسی کو نہیں، نماز کی امامت سے یہ اشارہ دیا کہ خلیفہ حضرت ابو بکر کو ہونا چاہیے	حضرت علی، ان کے حق میں وصیت کی گئی	کسی کو نہیں، نماز کی امامت سے یہ اشارہ دیا کہ خلیفہ حضرت ابو بکر کو ہونا چاہیے
امام کی شرائط	جو میرٹ پر پورا اترے	آل محمد میں سے ہونا ضروری ہے	جو میرٹ پر پورا اترے
سیدنا ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا مقام	جلیل القدر صحابہ اور افضل ترین امتی	اکثر شیعہ تنقید کرتے ہیں اور بعض احترام کرتے ہیں	جلیل القدر صحابہ، حضرت عثمان کے آخری چھ سالوں پر تنقید
سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا مقام	جلیل القدر صحابی اور چوتھے خلیفہ	پہلے امام اور امت کے افضل ترین انسان	واقعہ تحکیم اور خوارج سے جنگ کی بنیاد پر ان پر تنقید
مذہبی و سیاسی امام کی حیثیت	عام انسان ہوتا ہے جس کا انتخاب لوگ کرتے ہیں، معصوم نہیں ہوتا	اللہ کی جانب سے مقرر ہوتا ہے اور گناہوں سے معصوم ہوتا ہے	عام انسان ہوتا ہے جس کا انتخاب لوگ کرتے ہیں، معصوم نہیں ہوتا

	اہل سنت	اہل تشیع	اباضی
امام مہدی	قیامت کے قریب پیدا ہوں گے	پیدا ہو چکے اور اس وقت غائب ہیں	-----
دین کا بنیادی ماخذ	قرآن اور سنت	قرآن، سنت، ائمہ اہل بیت	قرآن اور سنت
احادیث کی اہم کتب	بخاری، مسلم، موطا، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابو داؤد، مسند احمد	نہج البلاغہ، کلینی، طوسی اور صدوق کے مجموعے (اصول اربعہ)	مسند ربیع بن حبیب
نماز، روزہ، حج، زکوۃ	فروعی اختلافات کے ساتھ کم و بیش ایک سے ہیں	فروعی اختلافات کے ساتھ کم و بیش ایک سے ہیں	فروعی اختلافات کے ساتھ کم و بیش ایک سے ہیں
تقیہ	حالت اضطرار میں کراہت کے ساتھ جائز ہے	فضیلت والی چیز ہے	حالت اضطرار میں کراہت کے ساتھ جائز ہے
متعہ	حرام ہے	جائز بلکہ مستحسن ہے	حرام ہے
محرم کی رسومات	بالعموم حرام اور شرعاً باطل ہیں	مستحسن ہیں	-----
مقدس شہر	مکہ، مدینہ، بیت المقدس	مکہ، مدینہ، بیت المقدس، نجف، کربلا، مشہد	مکہ، مدینہ، بیت المقدس
اہم تہوار	عید الفطر، عید الاضحی	عاشورہ محرم، عید الفطر، عید الاضحی	عید الفطر، عید الاضحی

تعمیر شخصیت

قرآن کے قانون وراثت پر عمل کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو اللہ تعالی نے جہنم کے عذاب کی وعید سنائی ہے۔ جو لوگ اپنی بیٹیوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیتے، وہ اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

اگلا ماڈیول

اس ماڈیول میں ہم نے تفصیل سے اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان متفق علیہ اور اختلافی امور کا جائزہ لیا ہے۔ اگلے ماڈیول میں انشاء اللہ ہم اہل سنت کے ذیلی گروہوں کا تفصیلی جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ مختلف امور کے بارے میں ان کے مابین کس کس نوعیت کے کیا کیا اختلافات پائے جاتے ہیں۔

ببلیوگرافی

الہامی کتب

1. قرآن مجید

اہل سنت کی کتب

2. ابن ماجہ۔ **السنن**۔ http://www.almeshkat.net/books/ (accessed 3 Oct 2011)

3. احسان الٰہی ظہیر۔ **الشیعۃ واہل البیت**۔ لاہور: ادارہ ترجمان السنۃ (2003) www.kitabosunnat.com (accessed 3 Oct 2011)

4. احمد بن حنبل۔ **المسند**۔ http://www.almeshkat.net/books/ (accessed 3 Oct 2011)

5. تمنا عمادی۔ **امام طبری اور امام زہری**۔ http://www.aboutquran.com/ba/ba.htm (accessed 3 Oct 2011)

6. حاکم نیشاپوری۔ **المستدرک علی الصحیحین**۔ http://www.almeshkat.net/books/ (accessed 3 Oct 2011)

7. حبیب الرحمن کاندھلوی۔ **ہماری مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت**۔ http://www.aboutquran.com/ba/ba.htm (accessed 3 Oct 2011)

8. سعد بن عبداللہ بن عبدالعزیز آل حمید۔ **مسند الربیع بن حبیب الاباضی: دراسۃ نقدیہ** (عربی) فی "مجلہ جامعۃ ام القری لعلوم الشریعۃ والدراسات الاسلامیہ، مکہ المکرمہ، رجب 1430/2009۔

9. سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ **تفسیر تفہیم القرآن**۔ www.iquranurdu.com (accessed 3 Oct 2011)

10. سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ **رسائل ومسائل**۔ www.quranurdu.com (accessed 3 Oct 2011)

11. سید ابوالحسن علی ندوی۔ **دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں**۔ کراچی: حاجی عارفین اکیڈمی

12. سید ابوالحسن علی ندوی۔ **دریائے کابل سے دریائے یرموک تک**۔ www.kitabosunnat.com (accessed 3 Oct 2011)

13. سید تنظیم حسین۔ **اسماعیلیہ**۔ کراچی: الرحیم اکیڈمی۔ www.ahlehuq.com (ac. 13 Oct 2011)

14. سید سلیمان ندوی۔ **اہل السنۃ والجماعۃ**۔ کراچی: مجلس نشریات اسلام (1997)

15. شاہ عبد العزیز محدث دہلوی 1788 (اردو ترجمہ: مولانا خلیل الرحمن نعمانی مظاہری)۔ **تحفہ اثنا عشریہ**۔ کراچی: دار الاشاعت۔

16. شبیر احمد ازہر میرٹھی۔ **احادیث دجال کا تاریخی مطالعہ**۔ لاہور: دار التذکیر (2005)

17. شمس الدین الذہبی۔ **میزان الاعتدال فی نقد الرجال** (عربی)۔ www.waqfeya.net (accessed 5 Feb 2007)

18. عبد الحلیم شرر۔ **حسن بن صباح**۔ لکھنو: دل گداز پریس (1922)

19. عبد الرحمن مبارکپوری۔ **تحفۃ الاحوذی بشرح جامع الترمذی** (عربی)۔ www.waqfeya.net (accessed 5 Feb 2007)

20. عبید اللہ رحمانی مبارکپوری۔ **عاشورہ محرم: روز عید یا روز غم وماتم**۔ ریاض: مرکز الدعوۃ والارشاد۔ www.kitabosunnat.com (accessed 3 Oct 2011)

21. عثمان بن محمد الناصری آل خمیس (مترجم: عبد الجبار سلفی)۔ **آئینہ ایام تاریخ**۔ مکتبہ اہل بیت العالمی۔ www.kitabosunnat.com (accessed 3 Oct 2011)

22. عطاء الرحمن شہباز مدنی۔ **شیعہ کی چالیس کفریہ عبارات**۔ فیصل آباد: اشاعت المعارف۔

23. علی بن ابی بکر الہیثمی۔ **مجمع الزوائد ومنبع الفوائد**۔ http://www.almeshkat.net/books/ (accessed 3 Oct 2011)

24. غلام رسول سعیدی۔ **شرح صحیح مسلم**۔ لاہور: فرید بک اسٹال (2003) www.nafseislam.com (accessed 3 Oct 2011)

25. فیض اللہ چترالی۔ آغاخانیت: علمائے امت کی نظر میں۔ چترال: سواد اعظم اہل سنت۔ http://freeurdubooksdownload.blogspot.com/2011/07/blog-post_1896.html (accessed 3 Oct 2011)

26. مالک بن انس۔ الموطا۔ http://www.almeshkat.net/books/ (accessed 3 Oct 2011)

27. ماہنامہ بینات (خصوصی اشاعت)۔ خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علمائے کرام کا متفقہ فیصلہ۔ کراچی: مکتبہ بینات، بنوری ٹاؤن۔

28. محمد اسماعیل المقدم۔ المہدی (عربی)۔ اسکندریہ: دار العلمیہ للنشر و التوزیع (2002)

29. محمد انعام اللہ بنوی۔ مسئلہ تحریف القرآن۔ کراچی: دار الافتاء بنوری ٹاؤن۔

30. محمد بن اسماعیل بخاری (194-256/810-870) ۔ الجامع الصحیح۔ http://www.almeshkat.net/books/ (accessed 3 Oct 2011)

31. محمد بن جریر الطبری۔ تاریخ الامم و الملوک (عربی)۔ مصر: دار المعارف۔ www.waqfeya.net (accessed 5 Feb 2007)

32. محمد بن طاہر البرزنجی اور محمد صبحی حسن حلاق۔ صحیح تاریخ الطبری (عربی)۔ بیروت: دار ابن کثیر۔ www.waqfeya.net (accessed 5 Feb 2007)

33. محمد بن طاہر البرزنجی اور محمد صبحی حسن حلاق۔ ضعیف و المسکوت عنہ تاریخ الطبری (عربی)۔ بیروت: دار ابن کثیر۔ www.waqfeya.net (accessed 5 Feb 2007)

34. محمد بن عیسی الترمذی (209-279/824-892)۔ السنن ۔ http://www.almeshkat.net/books/ (accessed 3 Oct 2011)

35. محمد تقی عثمانی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق۔ کراچی: ادارۃ المعارف۔ http://www.tauheed-sunnat.com/sunnat/category/urdu-books/sahaba-iqram (accessed 3 Oct 2011)

36. محمد ثاقب رسال پوری۔ حضرت امیر معاویہ اور تاریخی روایات۔ کراچی: مکتبہ معارف القرآن (2010)

37. محمد حنیف ندوی۔ مرزائیت نئے زاویوں سے۔ www.kitabosunnat.com (accessed 3 Oct 2011)

38. محمد سرفراز خان صفدر۔ **ارشاد الشیعہ**۔ گوجرانوالہ: مکتبہ صفدریہ (2001)

39. محمد عبدالرشید نعمانی۔ **یزید کی شخصیت: اہل سنت کی نظر میں**۔ کراچی: الرحیم اکیڈمی (2004)

40. محمد عبدالرشید نعمانی۔ **اکابر صحابہ اور شہدائے کربلا پر ایک افترا**۔ کراچی: الرحیم اکیڈمی، طبع 2003

41. محمد عزیر شمس۔ **مقدمہ زیارت قبر نبوی**۔ گوجرانوالہ: ام القری پبلی کیشنز (2010)

42. محمد کرم شاہ الازہری۔ **تفسیر ضیاء القرآن**۔ www.nafseislam.com (accessed 3 Oct 2011)

43. محمد منظور نعمانی۔ **شیعہ سنی اختلافات: حقائق کے آئینہ میں**۔ http://www.tauheed-sunnat.com/sunnat/category/urdu-books/shia-shiyat-islam-quran-or-sahaba (accessed 3 Oct 2011)

44. محمد نافع۔ سیرت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ۔ لاہور: تخلیقات (1995)

45. محمود طحان۔ ترجمہ: محمد مبشر نذیر۔ **تیسیر مصطلح الحدیث**۔ http://www.mubashirnazir.org/ER/Hadith/L0004-00-Hadith.htm

46. مسلم بن حجاج (204-261/819-875)۔ **الجامع الصحیح**۔ http://www.almeshkat.net/books/ (accessed 3 Oct 2011)

47. مفتی عبدالستار۔ **شہادت حسین رضی اللہ عنہ**۔ ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ (2010)

48. Fazal ur Rahman. ***Revival and Reform in Islam.*** P 36. London: One World Publications (2006)

49. Nomani, Mohammad Manzoor. ***The Event of Ghadir Khumm in the Qur'an, Hadith and History.*** http://www.islamawareness.net/Deviant/Shia/ghadir.html (accessed 3 Oct 2011)

اہل تشیع کی کتب

50. ابو مخنف لوط بن یحیی۔ ترجمہ: سید تبشر الرضا کاظمی۔ **مقتل ابی مخنف اور قیام مختار**۔ اسلام آباد: محمد علی بک ایجنسی (2004) http://www.shiamultimedia.com/urdubooks.html (accessed 16 Apr 2010)

.51 حسن مہدی الشیرازی(1972)۔**المسلمون العلویون**۔
(accessed 3 Oct 2011) http://www.freemoslem.com/showthread.php?t=222

.52 حسین بخش جاڑا۔**تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف**۔ بھکر: مکتبہ انوار النجف۔
(accessed 16 Apr 2010) http://www.shiamultimedia.com/urdubooks.html

.53 سید شریف رضی(1015-970/406-359)۔**نہج البلاغۃ**(عربی)۔شرحه وضبط نصوصه: الإمام محمد عبده۔
بیروت:موسسہ المعارف(1990)۔

.54 سید شریف رضی(1015-970/406-359)۔**نہج البلاغۃ**(عربی)۔منتديات مقهى الأصدقاء۔
(accessed 19 Apr 2007) www.PalsCoffee.com

.55 سید شریف رضی(1015-970/406-359)۔**نہج البلاغۃ** اردو ترجمہ و شرح:سید ذیشان حیدر جوادی۔کراچی: محفوظ
بک ایجنسی(1999)

.56 سید عبدالحسین شرف الدین۔**مجالس فاخرہ**۔
(accessed 16 Apr 2010) http://www.shiamultimedia.com/urdubooks.html

.57 شیخ صدوق ابی جعفر محمد بن علی القمی(c. 306-381/918-991)۔ترجمہ:سید حسن امداد ممتاز الافاضل۔**من لایحضرہ**
الفقیہ۔کراچی:الکساء پبلشرز http://www.shiamultimedia.com/urdubooks.html (accessed 16 Apr
2010)

.58 شیخ صدوق شیخ صدوق ابی جعفر محمد بن علی القمی(c. 306-381/918-991) ۔ترجمہ:مظہر عباس چوہدری۔**فلسفہ غیبت**
مہدی۔لاہور: ادارہ منہاج الصالحین(2007)۔
(accessed 16 Apr 2010) http://www.shiamultimedia.com/urdubooks.html

.59 عباد بن صاحب(385-326)۔**الزیدیہ**(عربی)۔http://al-mostafa.info (accessed 3 Oct 2011)

.60 علی حسین رضوی۔**تاریخ شیعیان علی**۔کراچی: امامیہ اکیڈمی(1992)
(accessed 16 Apr 2010) http://www.shiamultimedia.com/urdubooks.html

.61 غلام علی گلزار۔**مذہب شیعہ امامیہ**۔کشمیر: تنظیم المکاتب۔
(accessed 16 Apr 2010) http://www.shiamultimedia.com/urdubooks.html

62. **قاتلانِ امام حسین کون؟** http://www.answering-ansar.org/answers/qatelaan_hussain/ur/index.php (accessed 3 Oct 2011)

63. **مبینہ تحریف القرآن کا قائل کون؟** http://www.answering-ansar.org/answers/tahreef_quran/ur/index.php (accessed 3 Oct 2011)

64. محمد باقر مجلسی(1025-1109/1616-1698)ترجمہ:سید بشارت حسین کامل مرزاپوری(1963)۔**حیات القلوب**۔امامیہ کتب خانہ۔http://www.shiamultimedia.com/urdubooks.html (accessed 16 Apr 2010)

65. محمد تیجانی سماوی۔**شیعہ ہی اصلی اہل سنت ہیں**۔کراچی:حسن علی بک ڈپو۔ http://www.shiamultimedia.com/urdubooks.html (accessed 16 Apr 2010)

66. محمد یعقوب کلینی(c. 250-329/864-940)۔**اصول الکافی**۔اردو ترجمہ:سید ظفر حسن نقوی امروہوی۔کراچی:ظفر شمیم پبلیکشنز ٹرسٹ

67. محمد یعقوب کلینی(c. 250-329/864-940)۔**الفروع من الجامع الکافی** (عربی)۔http://www.almurtadha.org/ (accessed 6 Jan 2011)

68. منتظر عباس نقوی۔**حفاظت قرآن**۔اسلام آباد:باب العلم ایجوکیشنل ٹرسٹ(1999) http://www.shiamultimedia.com/urdubooks.html (accessed 16 Apr 2010)

69. موسی الموسوی(اردو ترجمہ:ابو مسعود آل امام)۔**اصلاح شیعہ**۔ www.kitabosunnat.com (ac. 18 Oct 2011)

70. ناصر مکارم شیرازی۔ترجمہ:سید صفدر حسین نجفی۔**تفسیر نمونہ**۔لاہور:مصباح القرآن ٹرسٹ(2006)۔ http://www.shiamultimedia.com/urdubooks.html (accessed 16 Apr 2010)

71. ناصر مکارم شیرازی۔ترجمہ:سید مختار حسین جعفری کشمیری۔**فلسفہ تقیہ**۔کراچی:رحمت اللہ بک ایجنسی۔ http://www.shiamultimedia.com/urdubooks.html (accessed 16 Apr 2010)

72. ناصر مکارم شیرازی۔**سوال تمہارے جواب ہمارے**۔قم،ایران:معارف اسلام پبلشرز۔ http://www.shiamultimedia.com/urdubooks.html (accessed 16 Apr 2010)

73. **نکاح المتعہ**۔http://www.answering-ansar.org/answers/mutah_urdu/ur/index.php (accessed 3 Oct 2011)

74. Ali, Justice Amir. *Spirit of Islam*. www.aboutquran.com/ba/ba (accessed 3 Oct 2011)

75. Ali, Muhammad E. "*Tomb of Firuzan (Abu-lolo) in Kashan to be Destroyed*" http://www.cais-soas.com/News/2007/June2007/28-06.htm, accessed 12 Sep 2011)

76. *Druze (Muwahidoon).* http://www.druze.org.au/religion/index.htm (accessed 3 Oct 2011)

77. Engineer, Asghar Ali. *Quran and Isma'ili Ta'wil.* http://andromeda.rutgers.edu/~rtavakol/engineer/ (ac. 13 Oct 2011)

78. *Fadak*: http://www.answering-ansar.org/answers/fadak/fadak_of_al_zahra.pdf (accessed 3 Oct 2011)

79. Hamawi, Sheikh Khodr. *Introduction to Ismailism*. www.ismaili.net. (accessed 3 Oct 2011)

80. *Imamate; The Perfection of Deen*. http://www.answering-ansar.org/shia_viewpoint/imamate_perfection_of_deen/en/index.php (accessed 3 Oct 2011)

81. *Innovation with regards to the Shari`i Penalty of Cursing Sahaba by "Sipah-e-Sahaba".* http://www.answering-ansar.org/answers/cursing_sahaba/en/index.php (accessed 2 Oct 2011)

82. *Quran and Ahlul-Bayt.* http://www.al-islam.org/encyclopedia/ (accessed 3 Oct 2011)

83. *Shi'a Usool al-Deen*. http://www.answering-ansar.org/fiqh/usool_al_deen/en/index.php (accessed 3 Oct 2011)

84. *Taqiyyah (Expedient dissimulation).* http://www.answering-ansar.org/answers/taqiyyah/en/index.php (accessed 3 Oct 2011)

85. *Temporary Marriage in Islam.* http://www.al-islam.org/encyclopedia/ (accessed 3 Oct 2011)

86. *The Khalifatullah in Shia'a belief*. http://www.answering-ansar.org/shia_viewpoint/khalifatullah_in_shia/en/index.php (accessed 3 Oct 2011)

87. *The Last Luminary.* http://www.al-islam.org/encyclopedia/ (accessed 3 Oct 2011)

88. *The non egalitarian nature of Imamate.* http://www.answering-ansar.org/answers/non_egalitarian_imamate/en/index.php (accessed 3 Oct 2011)

89. *The origins of Shia'a.* http://www.answering-ansar.org/shia_viewpoint/origins_of_shia/en/index.php (accessed 3 Oct 2011)

90. *To know the Shi'a.* http://www.answering-ansar.org/shia_viewpoint/to_know_the_shia/en/index.php (accessed 3 Oct 2011)

اباضیہ کی کتب

91. احمد الیاس حسین۔دور فقهاء الإباضية في إسلام مملكة مالي(عربی)۔http://www.ibadiyah.net (accessed 8 Jan 2011)

92. ربیع بن حبیب۔المسند۔http://www.islamweb.net/hadith/display_hbook.php?bk_no=1 (accessed 3 Oct 2011)

93. سلیمان البارونی(1936)۔مختصر تاریخ الاباضیہ(عربی)۔ (accessed 3 Oct 2011) www.scribd.com

94. عمرو النامی۔دراسات الإباضية(عربی)۔http://www.ibadiyah.net (accessed 8 Jan 2011)

95. محمد بن یوسف اطفیش۔الفكر السياسي عند الإباضية (عربی)۔http://www.ibadiyah.net (accessed 8 Jan 2011)

96. محمد یحیی علی المعمر۔الإباضية في فرق الإسلامية (عربی)۔http://www.ibadiyah.net (accessed 3 Oct 2011)

97. محمد یحیی علی المعمر۔الإباضية في ليبيا (عربی)۔http://www.ibadiyah.net (accessed 8 Jan 2011)

98. محمد یحیی علی المعمر۔ الإباضية: مذهب إسلامي معتدل(عربی)۔http://www.ibadiyah.net (accessed 3 Oct 2011)

99. Ennami, Dr. Amr Khalifa. *A Concise History of Al-Ibadhiyah.* http://www.angelfire.com/ok5/ibadhiyah/history.html (accessed 3 Oct 2011)

100. Mu'mar, Ali Yahya (Translation: Khalsa H. Al Aghbari.) *Readings on the Ibadhi Thought*. http://www.islamfact.com/all_topics/ibadhis/3073.html (accessed 3 Oct 2011)

101. Mu'mar, Ali Yahya. *The Ibadhi Sect: A Moderate Sect of Islam.* http://www.scribd.com/doc/19433261/The-IBADHI-SECT-a-Moderate-Sect-of-Islam (ac. 13 Oct 2011)

غیر جانبدار ذرائع کی کتب

102. Arnold, Thomas W. Preaching of Islam: *A History of Propagation of Muslim Faith.* www.archive.net (accessed 3 Oct 2011)

103. BBC Religions. *Sunni and Shi'a.* http://www.bbc.co.uk/religion/religions/islam/subdivisions/sunnishia_1.shtml (accessed 3 Oct 2011)

104. Hoffman, Valerie J. *Ibadi Islam: An Introduction.* http://www.uga.edu/islam/ibadis.html (accessed 3 Oct 2011)

105. Koerner, Brendan I. (2004). *So You Want To Be an Ayatollah: How Shiite clerics earn the name?* Slate on the web 6 Apr 2004. http://www.slate.com/articles/news_and_politics/explainer/2004/04/so_you_want_to_be_an_ayatollah.html (accessed 3 Oct 2011)

106. Religionfacts.com. *Comparison of Sunni and Shia Islam*. http://www.religionfacts.com/islam/comparison_charts/islamic_sects.htm (accessed 3 Oct 2011)